Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۵۹ء

قرآن میں ہے

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ - تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (دوسروں کی پرورش کے لئے) دیدیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَقْتَسِمُ وَرَثَتِي دِينَاراً - مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِي وَ مُؤْنَةِ عَامِلِي فَهُوَ صَدَقَةٌ -

(بخاری جلد ۴، صفحہ ۱۰۱، کتاب الفرائض)

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان کے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر: 7500
خط و کتابت کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

جلد ۱۲ | فروری سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات		۲
ڈاکٹر عبدالوہاب عزام	(محترم پرویز صاحب)	۹
مجلس قلندران اقبال		۱۰
لاہور کا ایک علمی مذاکرہ		۱۴
سیکولر اسلام		۲۳
ملکیت زمین		۳۰
باب المراسلات		۳۸
اسلام کی سرگذشت		۵۰
حقائق و عبر		۶۹
طلوع اسلام کنونشن		۷۷
رابطہ باہمی		۷۹

لمعات

زرعی اصلاحات

حکومت کی طرف سے زرعی اصلاحات کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیں۔ کابینہ نے ان پر غور و خوض کے بعد کچھ فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کا ملخص رات (یعنی ۲۴ اور ۲۵ کی درمیانی شب) محترم صدر مملکت پاکستان نے ریڈیو سے نشر کیا۔ ان میں سے قرآنی نقطۂ نگاہ سے اہم فیصلے یہ ہیں کہ (۱) کوئی شخص ایک خاص رقبہ سے زیادہ زمین اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے گا۔ (۲) زائد زمین کو حکومت معاوضہ دے کر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ جاگیروں کا معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ (۳) اگر کسی کے پاس ایک خاص معینہ رقبہ سے کم زمین رہ جائے تو وہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ بغور دیکھئے تو ان میں دو فیصلے ایسے ہیں جنہیں اصولی کہا جائے گا۔ یعنی ایک خاص رقبہ سے زائد زمین مالکانِ اراضی سے لے لی جائے گی اور ایک خاص رقبہ سے کم اراضی تقسیم نہیں ہو سکے گی۔

زمین کی ملکیت کے متعلق قرآنی مسلک کی وضاحت ایک مدت سے طلوعِ اسلام میں ہوتی چلی آرہی ہے (اشاعتِ زیرِ نظر میں بھی اس موضوع پر ایک مقالہ شائع ہو رہا ہے) اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی ربوبیت (پرورش) اور ہدایت (راہ نمائی) اپنے ذمے لی۔ ربوبیت کے لئے اس کا سامانِ رزق زمین میں جمع کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ وہ اس میں سے حسبِ ضرورت نکال کر کھاتا رہے۔ راہ نمائی کے لئے اس نے اپنے رسول بھیجنے شروع کر دیئے۔ ربوبیت اور ہدایت کے بذمۂ خدا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ یہ چیزیں بطور موہبت (بلاقیمت و بلامعاوضہ) ملیں گی۔ چنانچہ جہاں ہر رسول یہ اعلان کرتا رہا کہ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ "میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا" زمین کے متعلق اس نے کہا کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ یہ تھا انتظامِ خداوندی۔ لیکن چونکہ زندگی کے اسٹیج پر ابلیس بھی آدمؑ کے ساتھ ہی آگیا تھا اس لئے اس نے خدائی نظام کے بگاڑنے میں ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے (طاقت کے زور پر) مائدۂ ارض کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا اور دوسرے نے ہدایت (خدائی راہ نمائی) پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور یوں رزق اور ہدایت (جو خدا کی طرف سے مفت ملتے تھے) قیمتاً بکنے لگ گئے۔ انسانیت کی تاریخ اسی کشمکش کی داستان ہے، جس کی رُو سے حزب اللہ (خدائی

جماعتیں) رزق و ہدایت کو نوعِ انسانی کے لئے عام کرتیں اور حزب الشیطان (ابلیسی قوتیں) ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرتی چلی آرہی ہیں۔ یعنی اس کشمکش میں موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) ایک طرف ہوتے ہیں اور فرعون، قارون اور ہامان دوسری طرف۔ اسی داستان کا حسین ترین باب حضور خاتم النبیینؐ کا عہدِ ہمایوں تھا جس میں رزق کے سرچشمے اور شمعِ ہدایت عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہو گئے۔ اس میں نہ کسی سرمایہ دار (زمیندار و جاگیردار) کا نام و نشان باقی رہا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ اور یوں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی" لیکن اس کے بعد پھر غیر قرآنی قوتوں نے زور پکڑ لیا اور سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت نے سر اُبھار لیا۔

قرآن نے کہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں آخر الامر حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اگر اس کشمکش کو تنہا خدا کے کائناتی قانون کے سپرد کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت دیر میں جا کر برآمد ہوتا ہے (کیونکہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے) اور اگر اس کے ساتھ انسانی دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو اس کے نتائج بہت جلد سامنے آجاتے ہیں۔ جس چیز کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کہا جاتا ہے وہ خدا کے کائناتی قانون کے مخفی اشارے ہوتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں موجودہ اقدامات انہی تقاضوں کے مظہر ہیں۔

ہمارے ہاں (دیگر مسلم ممالک کی طرح) مفاد پرست گروہ کا موقف یہ تھا کہ انہیں زمین پر ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ان کے اس موقف کی تائید مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس قسم کے فتاویٰ جاری کرتے تھے کہ

> اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں.....
>
> جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی۔ اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔
>
> (مسئلہ ملکیت زمین۔ از سید ابو الاعلیٰ مودودی صفحہ ۳۔۴)

یہ موقف اور یہ اصول، قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ حکومت نے یہ فیصلہ کر کے کہ ایک خاص رقبے سے زائد زمین حکومت کی تحویل میں آجائے گی زمینداروں کے اس موقف اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے اس اصول کو توڑ کر رکھ دیا ہے اور اس طرح قرآنی اصول و نظام کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت کا یہ اقدام مستحقِ ہزار مبارکباد ہے کہ اس سے زمینداری کے غیر اسلامی نظام کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت نے فاضلہ رقبوں کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے "موجودہ مالکوں" کو معاوضہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے لیکن اس سے ذاتی ملکیت کا اصول بہرحال باقی نہیں رہتا۔ "ذاتی ملکیت" کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ مالک کی رضامندی کے بغیر اس شے کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لے یا کسی دوسرے کے قبضے میں دیدے۔

جب حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اتنے رقبہ سے زائد رقبے کو حکومت اپنے قبضے میں لے لیگی تو اس سے ملکیت کا دعویٰ متزلزل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہے اور حیثیت مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام آیا ہے اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔ ہم نے دسمبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت (کے لمعات) میں لکھا تھا کہ

> یہاں تک زمینداریوں کا تعلق ہے اگر سر دست یہ ناممکن ہو کہ زمین کو بالکلیہ افراد کی ملکیت سے نکال لیا جائے تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی ملکیت کے رقبوں کی اس طرح تحدید کر دی جائے کہ نہ کسی کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین رہے اور نہ کوئی کاشتکار زمین کے مناسب قطعہ سے محروم رہے۔ قدم اول کی حیثیت سے یہ تحدید بجائے خویش قرآن کے منشاء کے مطابق ہوگی۔

للہ الحمد کہ حکومت کا یہ پہلا قدم اس کے مطابق اٹھا ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں پانچ صد ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی رقبہ (جو بعض حالات میں اس سے بڑھ سکتا ہے) زیادہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ رقبہ کی مقدار اتنی ہونی چاہیے تھی جس سے ایک خاندان باعزت گذارہ کر سکے۔ پانصد ایکڑ (بلکہ اس سے بھی زیادہ) رقبہ اراضی کی آمدنی اور زائد رقبہ کا زر معاوضہ مترفین کے اس طبقہ کو باقی رکھے گا جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے اور فاضلہ دولت کے بل بوتے پر معاشرہ پر مختلف نوعیتوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ قدم اوّل بہر حیثیت موجودہ صورت حالات سے کہیں بہتر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے ذاتی ملکیت کا اصول متزلزل ہو جاتا ہے۔

ہمارے "ارباب شریعت" کی طرف سے زمین پر ذاتی ملکیت کی تائید میں دوسری دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اگر زمین پر ذاتی ملکیت نہ رہے تو قانونِ وراثت کا کیا بنے گا۔ ہم نے انہیں بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جب قرآن کی رُو سے زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اس ضمن میں قانونِ وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی بات کو برابر دُہرائے چلے جاتے۔ حکومت نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اگر رقبہ اراضی ایک خاص کمتر حد تک پہنچ جائے تو اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی شخص کے پاس دس ایکڑ زمین ہے اور اس کے چار لڑکے ہیں۔ ہمارے ارباب شریعت کے خیال کے مطابق یہ زمین ان چار لڑکوں میں بٹ جانی چاہیئے۔ لیکن حکومت کے حالیہ فیصلے کے مطابق یہ زمین ان لڑکوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قطعہ اراضی کی آمدنی میں ان سب لڑکوں کا حصہ ہوگا اور اس اعتبار سے وہ متوفی کے ترکہ کے وارث قرار پائیں گے۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس فیصلہ سے قانونِ وراثت اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ موجودہ قانونِ وراثت کی رُو سے ان لڑکوں (متوفی کے ورثا) کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اس رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے مالک بن جائیں۔ لیکن حالیہ فیصلے کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ انہیں اس رقبہ کا مشترکہ انتظام کرنا ہوگا ورنہ حکومت اسے (مناسب معاوضہ دیکر) اپنی تحویل میں لے لیگی۔ اس سے وراثت میں زمین پر حق ملکیت کا اصول ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ اصول قائم ہو جاتا ہے کہ حکومت، عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے، زمین کا جس قسم کا انتظام چاہے کر سکتی ہے۔ اور یہی قرآن کا منشاء ہے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ زائد زمین کا معاوضہ دے کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر اسے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ، جاگیرداری کی طرح، زائد زمین بھی بلا معاوضہ حاصل کر لی جاتی اور اسے بلا قیمت کاشتکاروں میں، حسب ضرورت، تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ انتظام زمین کے متعلق قرآنی تصور سے زیادہ قریب ہوتا۔ بایں ہمہ یہ اعلان بڑا اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی طرف سے زمین کے اس لین دین کے سلسلہ میں خزانۂ عامرہ پر کسی قسم کا کوئی بار نہیں پڑے گا اور "کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں" لگا دی جائے گی۔

حکومت کی طرف سے شائع شدہ پریس نوٹ میں (جو اب ہمارے سامنے آیا ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ رقبہ اراضی "گذارہ کی حد تک" سمٹ جائے، اس کا کوئی حصہ (رہن، بیع یا ہبہ کے ذریعے) الگ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ پورے کا پورا الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ زمین کو رہن رکھنے کی قطعاً اجازت نہ دی جاتی اور بیع کی صورت میں یہ پابندی لگا دی جاتی کہ اسے صرف حکومت کے پاس فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت اسے اس شخص کے ہاتھ فروخت کرتی جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم رقبہ ہو۔ اگر بیع پر اس قسم کی پابندی نہ لگائی گئی تو رفتہ رفتہ، یہ چھوٹے چھوٹے قطعات، (پانصد یا ایک ہزار ایکڑ کی حد تک) چند نفوس کے پاس اکٹھے ہوتے جائیں گے اور مالک کاشتکاروں کی حیثیت پھر مزارعوں کی رہ جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزارعوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے حالیہ فیصلوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی شکل پیدا نہ ہونے دی جائے جس میں پانچ پانچ سو ایکڑ والے زمیندار بکثرت پیدا ہو جائیں اور محنت کرنے والے مزدور کے مزدور رہ جائیں۔

پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذاتی اوقاف کی اراضیات ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جو اس وقت صرف ان کی آمدنی سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی نسبتاً بہتر ہے۔ قرآن کی رو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کسی مردہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور اس طرح اپنے اختیارات کو ابدیت سے ہمکنار کر دے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ افتادہ زمینوں کے مالکان کو نوٹس دیا جائے گا کہ وہ ایک مدت معینہ کے اندر اندر رقبہ کو زیر کاشت لائیں۔ بصورت دیگر حکومت اس زمین کو اپنی تحویل میں لے لیگی۔ یہ فیصلہ بھی بڑا مستحسن ہے۔ اس سے بھی اصولِ ملکیت کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز زید کی ملکیت میں ہے (زید کو حق حاصل ہے کہ اسے استعمال میں لائے یا ویسے ہی پڑا رہنے دے۔ قرآن اس قسم کا حق ملکیت اساسی طور پر کسی شے میں بھی تسلیم نہیں کرتا۔ نہ زر میں۔ نہ زمین میں (حتیٰ کہ نہ انسان کی اپنی جان میں) یہ چیزیں نوع انسان کی منفعت کی ہیں اور انہیں قوانین خداوندی کے مطابق، اس مقصد کے لئے صرف میں لانا چاہیئے۔

یہ ہیں بہر حال، وہ چند موٹی موٹی تفصیلات، جو حکومت کے حالیہ فیصلہ کے سلسلے میں ان سطور کی تسوید تک سامنے آئی ہیں جیسا کہ ہم نے ابتداءً لکھا ہے حکومت اپنے اس فیصلہ کے لئے مستحق تبریک و تہنیت ہے۔ بحیثیت مجموعی، یہ زمین کے انتظام کے ضمن میں قرآنی نظام کی طرف قدم اول ہے جسے فی الحقیقت بڑی جرأت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہی وہ احساس تشکر و تبریک ہے جس کے

اظہار کے لئے حسبِ ذیل تار قرآنک ریسرچ سینٹر اور ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جنرل محمد ایوب خان، صدرِ مملکت پاکستان کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے۔

> زرعی اصلاحات کے جرأت مندانہ اقدام پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ قرآن کی رو سے زمین کو عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ ان اصلاحات سے زمین پر ذاتی ملکیت کے غیر قرآنی اصول کی بنیادیں ہلا کر اور رقبوں کی تحدید سے قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اور یہ باکانہ اٹھایا ہے۔ اس سے ملک کی معاشی حالت خوشگوار ہو جائے گی اور کمیونزم کا سیلاب رک جائے گا۔ خدا آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے تاکہ آپ اس آئیڈیالوجی کو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، عملی حقیقت بنا سکیں اور اس طرح یہ خطۂ زمین اسلامی نہجِ زندگی کا گہوارہ بن جائے۔

ہم اس مقام پر دہرا دیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے مطابق، تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے حکومت، ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ مملکت کی۔ "ذرائع پیداوار" میں صرف زمین ہی شامل نہیں، دورِ حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت، کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اسی قسم کی اصلاحات پر توجہ دے گی۔ اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں، اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ (ضرورت سے زیادہ) دولت کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں حجاب ہو جائیں

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است

۲۔ کیریکٹر کیسے پیدا ہوتا ہے

سابقہ اشاعت لمعات میں ہم نے بتایا تھا کہ کسی قوم کا مستقبل اس قوم کے بچوں کی تعلیم کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ آنے والی نسلوں کو جس قسم کی تعلیم دی جائے گی اسی قسم کی اس قوم کی تقدیر بن جائے گی۔ اسی ضمن میں ہم نے لکھا تھا کہ صحیح تعلیم ہی سے وہ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے جس کے اپنے ہاں فقدان کا ہم آج رونا روتے ہیں۔ اور وعدہ کیا تھا کہ اس نکتہ کی وضاحت آئندہ اشاعت میں کی جائے گی۔ زیرِ نظر سطور میں اسی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں ایک عام کہاوت ہے کہ "مال صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو مال، جان، آبرو، میں سے ہر شے اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر اور مستحقِ حفاظت ہے لیکن اگر کبھی ایسا واقعہ پیش آ جائے کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز بچائی

جا سکے تو جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دینا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جان کی قدر و قیمت مال سے زیادہ ہے۔ لیکن اگر کسی وقت جان اور آبرو میں تصادم (CLASH) ہو جائے یعنی ان میں سے ایک ہی بچائی جا سکے۔ تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان کو قربان کر دینا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آبرو کی قیمت جان سے بھی زیادہ ہے۔ اور آبرو سے بڑھ کر کسی چیز کی قیمت نہیں۔ یعنی کوئی شے ایسی نہیں جس کے حصول یا حفاظت کے لئے آبرو کو قربان کر دینا جائز قرار پا سکے۔ اس حقیقت کو بالفاظِ دیگر یوں بیان کریں گے کہ مال اور جان کی قیمت اضافی (RELATIVE) ہے لیکن آبرو کی قیمت مطلق (ABSOLUTE) یا ذاتی (INTRINSIC) ہے۔ اخلاقیات کی دنیا میں اس قسم کی چیزوں کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اقدار جن کے تحفظ کے لئے ان سے کم قیمت کے اقدار کو قربان کر دینا چاہیئے لیکن انھیں کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

لیکن جہاں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو آبرو کے تحفظ کے لئے جان کو بلا تامل سپرد اجل کر دیں گے وہاں آپ ایسے لوگ بھی دیکھیں گے جو آبرو کے لئے جان دینا تو ایک طرف اسے دو ٹکوں کے عوض بیچ ڈالیں گے۔ یعنی ان کے نزدیک مال کی قدر آبرو سے کہیں زیادہ ہوگی۔ آپ ان لوگوں کو نہایت ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے لیکن انھیں اس کا احساس تک بھی نہیں ہوگا کہ ان سے کوئی معیوب حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ کی نگاہوں میں آبرو کی قیمت مال سے زیادہ ہے اور ان کے نزدیک مال کی قیمت آبرو سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں کے متعلق آپ کہیں گے کہ ان کا کوئی کیریکٹر نہیں۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کیریکٹر کے معنی یہ ہیں کہ بلند تر قدر کی خاطر کمتر قدر کو قربان کر دیا جائے۔ جن قوموں کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ ان کے افراد کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور اس کے تحفظ کے لئے ذاتی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں جو کچھ گذشتہ دس گیارہ سال سے ہوتا رہا وہ اس کے برعکس تھا۔ یعنی لوگ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے تھے۔ اسی کا نام کیریکٹر کا فقدان تھا۔ سوال یہ ہے کہ جن قوموں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان کے افراد میں اس قسم کا کیریکٹر کیسے پیدا ہو گیا؟ آپ ان کی تاریخ پر غور کیجئے۔ اس سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے صدیوں سے اپنے بچوں کو اس بات کی تعلیم دینی شروع کر رکھی ہے کہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا شرف و عزت کا باعث ہے۔ ان کے بچوں کو یہ تعلیم صرف مدرسوں اور کالجوں کی چاردیواری میں ہی نہیں دی جاتی۔ وہ جدھر سے گزرتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں، ہر طرف سے یہی آواز ان کے کان میں پڑتی ہے۔ یہی وہ فضا ہے جس میں وہ زندگی کے اولیں سانس سے نشو و نما پاتے ہیں۔ کتابوں میں۔ اخباروں میں۔ تقریروں میں۔ چرچ میں۔ سینما ہال میں۔ گھر میں۔ کھیل کے میدان میں۔ بزم میں۔ رزم میں۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر یہی نقشہ ان کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ علم النفس کا اصول یہ ہے کہ اگر آپ دو تین نسلوں تک بچوں کو ایک خاص نہج کی تعلیم و تربیت دیں تو اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اسی قسم کے خیالات دل میں لے کر ابھریں گی۔ جس طبقہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک مال کے مقابلہ میں آبرو کی قیمت کچھ نہیں، آپ ان کے بچوں کو ابتداء ہی سے اُن کے ماحول سے نکال کر ایسے ماحول کی طرف منتقل کر دیں، جہاں ان کے کان میں مسلسل اور پیہم یہ آواز پڑتی رہے کہ آبرو کی قیمت مال سے کہیں زیادہ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے ہو کر ان کے زاویۂ نگاہ میں کس قدر تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں

ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے کہ مختلف اقدار کی تعلیم تو ایک طرف، ان کا تصور تک بھی کسی کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔ کسی کو یہ بتایا ہی نہ گیا کہ زندگی کی کچھ اقدار بھی ہوتی ہیں اور یہ اقدار ہی ہیں جن سے انسان حیوانی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

قرآن کریم زندگی کی اقدار کا تعین کرتا ہے۔ وہ مستقل اقدار بھی دیتا ہے۔ اور اضافی بھی۔ نیز وہ اپنی حکمتِ بالغہ سے ایسے مواقع کی تصریح بھی کرتا ہے جن میں ایک کمتر درجہ کی قدر کو بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ان اقدار کو واضح طور پر سامنے لایا جائے اور مسلسل اور پیہم تکرار و اصرار سے انہیں دل کی گہرائیوں میں جاگزیں کر دیا جائے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ ان اقدار کے تحفظ سے نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں اور اس کا ثبوت تاریخی دلائل و شواہد سے بہم پہنچایا جائے۔ اس طریق تعلیم سے ان اقدار کی صداقت کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت یقین پیدا ہو جائے گا (اسی کو ایمان کہتے ہیں) اور اس سے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی جس سے ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین ہو سکے گا۔ جب یہ سلسلۂ تعلیم دو چار نسلوں تک مسلسل جاری رہے گا تو معاشرہ میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جائیگی جن کے ذہنوں میں ان اقدار کی گونج اور جن کی زبانوں پر ان کا چرچا ہوگا۔ اس سے وہ فضا پیدا ہو جائے گی جس میں سانس لینے والے بچے غیر شعوری طور پر ان اقدار کا احساس لیتے ہوئے پروان چڑھیں گے۔ چونکہ عمل کی بنیاد انسان کے نظریات و تصورات پر ہوتی ہے۔ اس لئے خیالات کی اس تبدیلی سے عمل میں خود بخود تبدیلی آجائے گی۔ اسی کا نام کیریکٹر ہے۔ چونکہ ہم کبھی اس طریق پر عمل پیرا نہیں ہوئے اس لئے ہمیں یہ بات کچھ یونہی قیاسی اور ذہنی سی دکھائی دیتی ہے (کہ اقدار کا صحیح تصور دل میں جاگزیں ہو جانے سے کیریکٹر میں تبدیلی آجاتی ہے) لیکن قرآن کے بیانات، اقوام عالم کے احوال و کوائف اور خود ہمارے قرن اول کی صحیح تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوم میں کیریکٹر پیدا کرنے کا اس کے سوا کوئی اور طریق نہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم اس اہم اور بنیادی ضرورت کی طرف برابر توجہ دلاتے رہے لیکن قوم لوٹ میں اس قدر منہمک اور مدہوش تھی کہ کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اگر ہم اس وقت قوم کی ابھرنے والی نسل کو سنبھال لیتے تو آج ہمارے معاشرہ کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس پر آنسو بہانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر ہم اب بھی اپنی توجہات اور مساعی کو اس بنیادی نقطہ پر مرکوز کر لیں تو ہمارا مستقبل پُر امید ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری جدید حکومت نے تعلیمی کمیشن کے تقرر سے اس بات کا ثبوت پیش کر دیا ہے کہ اسے اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہے لیکن (جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا) قرآن کی صحیح تعلیم یعنی اقدار کے صحیح تصور کا سوال اس کمیشن کے حدودِ تحقیق و سفارشات میں نہیں۔ اس لئے یہ کمیشن اس نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کا حل پیش نہیں کر سکے گا۔ ہم ایک مرتبہ پھر اربابِ متعلقہ کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ ملک کے حالات میں صحیح تبدیلی پیدا کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ "مذہبی اور دنیاوی" درسگاہوں کی موجودہ ثنویت کو ختم کر کے، اسکولوں اور کالجوں میں قرآن کی صحیح تعلیم کو عام کر دیا جائے۔ اور جب تک ہماری نئی نسل اس تعلیم سے آراستہ ہو کر عملی میدان میں نہ آئے، قوم کے موجودہ طبقہ کے اعمال پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ اس نگرانی سے کم از کم ملک کی موجودہ حالت سنبھلی رہے گی اور جب ہماری نئی نسل، دل و دماغ میں قرآنی اقدار کا تصور لئے عملی میدان میں آئے گی تو وہ پاکستان کو نہ صرف اقوام عالم کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا دیگی بلکہ اسے زندہ قوموں کی صف میں باعزت و باوقار مقام کا اہل ثابت کر دے گی۔ اسی سے قوم کے پاؤں سے قدامت پرستی کے جمود کی زنجیریں اتریں گی اور اسی سے اسے وہ قوت عطا ہو جائے گی جس سے اس کے بازو کہکشاں گیر ہو جائیں گے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد!

جمعہ، ۳۰ جنوری کی صبح اچانک اطلاع ملی کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کا، حرکتِ قلب بند ہو جانے سے، الریاض میں انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر اس قدر غیر متوقع اور یہ سانحہ ایسا ہوش رُبا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر عزام ہی کی حرکتِ قلب بند نہیں ہوئی، علم و عشق کی محفلوں کے چراغ گُل ہوگئے۔ اس حادثہ جانکاہ سے عالمِ اسلامی کو کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ دوسرے بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس سے میرے دل پر کیا گذری ہے اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ میری آنکھیں ہنوز علامہ اسلم جیراجپوری جیسے غمخوار رفیق اور مشفق بزرگ کی یاد میں شبنم فشانیوں سے آسودہ نہیں ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر عزام جیسے غمگسار دوست اور جاں نواز ہمسفر کی جدائی وجہ اختر شماری بن گئی۔

مرحوم کو اقبال اور قرآن سے عشق تھا اور ان کا یہی عشق ہمارے روابط کی بنیاد بنا۔ ہم جوں جوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے قلب و نظر کی ہم آہنگی بڑھتی چلی گئی تا آنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی کہ ہمارے راستے بھی ایک ہیں اور منزل بھی ایک۔ اس رفاقت سے میرا سفر خیاباں خیاباں چمن ہوگیا ـــ آج میں اس راہ گذر میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں ـــ بالکل تنہا۔

میں نے اپنے مرحوم دوست کو بہت قریب سے دیکھا۔ عربی ادب و لغت میں ان کی شہرت تھی ایک الگ داستان ہے۔ لیکن ایک انسان اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُن کا جو مقام تھا مجھے آج اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اُن کا قلب عبارت تھا قرآن کے عشق، اسلام کی محبت اور ملت کے بے پایاں درد سے۔ نگاہ کی بلندی۔ ظرف کی وسعت۔ دل کی کشاد۔ سیرت کی پاکیزگی۔ کردار کی پختگی۔ فکر کی رفعت۔ جذبات کی گہرائی۔ ذوق کی لطافت اور شوق کی وارفتگی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ پیکرِ اخلاص و محبت۔ وہ عشق و زیرکی کا حسین امتزاج۔ وہ دین و دانش کا پاکیزہ گہوارہ۔ وہ یگانۂ علم و فضیلت کا امام۔ وہ جہانِ تپش و خلش کا شعلۂ بیباک۔ وہ مصافِ زندگی میں شمشیرِ عریاں۔ وہ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں۔ ہم میں نہ رہا ـــ اس کے جانے سے علم کی بستیاں اُجڑ گئیں۔ عشق کی محفلیں سنسان ہوگئیں۔

سلام اے "نور و نکہت کی داستانِ خموش" ـــ تجھ پہ ہزاروں سلام!!

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ　　چوں تو از دودۂ آتش نفساں می خیزد

جگر فگار

پرویز

بہ یادِ عزامؒ

مجلسِ قلندرانِ اقبال

ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ کے محترم پرویز صاحب کے ساتھ کس قسم کے تعلقات تھے اور کس طرح ان السعدین سے فلکِ اقبال اور قرآن پر کس کس انداز کی مجسم آرائیاں ہوتیں، اس کا اندازہ "مجلسِ قلندرانِ اقبال" کے تعارف سے ہو سکے گا جو مرحوم کے زمانۂ سفارتِ مصر (در پاکستان) کے دوران میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ جب ڈاکٹر عزامؒ اواخر ۱۹۵۴ء میں پاکستان سے تبدیل ہو کر عازمِ حجاز ہوئے تو اس مجلس کی کہانی محترم خورشید عالم (ایکے از قلندران) کے قلم سے مرتب ہو کر طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی ——— ہم اس کہانی کو آج مرحوم کی یاد میں دہراتے ہیں۔ آپ بھی اسے سنئے اور ہماری اشکباری میں شریک ہو جائیے۔

(طلوعِ اسلام)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ سفیرِ مصر اُن سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکتِ مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش (بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پرویز صاحب ابھی یہ کم متحیر نہ تھے کہ پیغام بر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبۂ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبالؒ سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انہیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح بڑے لوگ "ضرورت کے وقت" اقبالؒ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں طالبِ علمانِ اقبال سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ہلکے سے ردِعمل کو بھی ختم کر دیا جو محترم سفیر سے ملاقات سے قدرتاً پیدا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے معذوری کا اظہار کیا، لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحب سیکرٹری مجلسِ اقبال) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحبِ موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارتخانۂ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب وہاں خود چلے گئے تھے ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؛ سفارتخانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بباطن خبیث، دختران مادر و پلوسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ ترقی کی دنیا ہے جو سود و سودا اکر و فن سے معمور ہے نہ کہ سوز و مستی

جذب و شوق سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گذر جن کے قلوب واذہان میں قرآن اور اقبال نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ سکونِ گہر بھی ہو۔ جو بستے رہنے کے باوجود نہ بستے ہیں، اور جن کی حالت یہ ہو

زہرہ ان در گذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہر حال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں" سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں، وہ درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انھیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے "من تو شدم تو من شدی" کی حقیقی "اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ سفرِ ملاقات "مجلس قلندرانِ اقبال" کا نقشِ اول تھی۔ اس مجلس کی کوئی باقاعدہ رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکانِ مجلس کی کشتِ جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ واضح تر ہوتا گیا۔ تا آنکہ ایک وقت اسے مجلسِ قلندرانِ اقبال کہہ دیا گیا، اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہر حال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے، اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے۔ یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آیندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں، اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر از اول تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنھوں نے پیامبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انھیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انھیں بھی شریک کر لیا جائے۔ لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریکِ مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو، لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تیاری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ غذا تھی جس کے بغیر نہ سینے کی کشود ممکن ہے، نہ قلب کا حضور، اور جب یہ دولت ہاتھ آجاتی ہے تو کوئی اس کو یہ قیام ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور قلندرانِ اقبال کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیل محالات ہے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع کسی مجلس کے لئے بظاہر شاید کافی ہے لیکن جن کے نزدیک

گردش لیل و نہار کا معیار ''اوقات ہمہ بود کہ بایار بسر رفت'' ہو، انھیں تو ہر وقت یہ خلش احساس رہتی ہے کہ ''حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد'' مجلس کے لئے دن کا کوئی تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کی حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست ہونے سے پیشتر یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات۔ انھیں بہرحال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا تھا۔ اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ ورنہ کوئی اور مصروفیت آئندہ یوم انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابل دید ہوا کرتا تھا۔ ''آئندہ کب؟'' کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں۔ گو انتظار کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری بے خودی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن ''مقرر'' ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب سودا بازی ''شروع ہو جاتی۔ چلئے ہم صبح صبح آ جائیں گے۔ اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آ جیئے اور پھر شب درمیان ہو گی بہت سا حساب بیباق ہو جائیگا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی سے کہا۔ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی ''غیر مجلسی'' مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ذوق حضور دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا: یہ موضوع زیادہ اہم ہے، یہ نکتہ زیادہ غور طلب ہے، ''اسے ایک ہی نشست میں نپٹا لینا چاہیئے'' وغیرہ وغیرہ سب کو رہ رہ کے خیال (اور بہت حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آ رہا ہے۔ سفیر صاحب ہیں کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی جلدی نہیں تیار ہو کر چلے جانا ہے۔ چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ــــ تا آنکہ ایک منٹ کا پس و پیش خلاف مصلحت ہو جاتا۔ اور سب بادل ناخواستہ اُٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطور بالا سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ مجلس قلندران اقبال میں مناصب کی تقسیم نہیں ہو گی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرض وجود میں نہیں لایا گیا، اور یوں بھی اس کی اٹھان اور نشو انجمنوں کے عام انداز و سیاق سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں، اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے، اور اس طریق سے جیسے وہ پہلے سے ''مقدر'' تھے۔

سب سے بڑا ''عہدہ'' پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندراں کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی۔ ہر چند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباس تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب نے اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبال پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ اور اپنے مطالعہ اقبال اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انھیں شیخ قلندراں کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں

ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انھیں "سفیرِ اقبال" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبال کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلامِ اقبال کا عربی میں ترجمہ کرکے آپ نے پوری دنیائے عرب کو فکرِ اقبال کے نور سے منور کر دیا۔ اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیرِ اقبال" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا، آج وہی ساقی، ساقی گری کی شرم رکھ کر اس انجمن محفل کی یاد کو دل و دماغ میں بسائے اس کی ہمہ تن کوئی کا فرض ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلا وجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدرِ ظرفِ عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے (میں نے اس وقت انھیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انھیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا) جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسا ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخ قلندران اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بیساختہ داد دی گئی۔ اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آپڑی۔ چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا۔ اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔ ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا۔ تقسیم کا کام قاسم کے سپرد ہوا۔ قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے۔ ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی۔ ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے، پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ نہ پوچھئے نہیں۔ دس بارہ قلندر جن کی "ہر لحظہ نئی شان، نئی آن" اسے کم دودھ، اُسے تیز قہوہ، یہ اتنی شکر، وہ اتنی شکر۔ مجلس قلندران کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخیِ چائے کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہان کی آزمائش کیا کرتے تھے۔ ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدِ نظر رکھنا پڑتی تھی۔ ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ قریباً ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ اگر وہ محفل سے پوچھے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو ان کا جواب "بلی" ہوگا۔ قلندروں کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں۔ ہاں تو یہ قاسم تھے سب کے ہر دل عزیز: عزیز الحسن۔

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا۔ لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے۔ یہ ان خدام مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبال کو نہ پا سکے، لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے۔ ابراہیم، شمیں، محمد، وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدام خانہ تھے۔ وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بے تابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا تھا۔ دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا۔ وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے۔ یہ ذہنی طور پر ہمارے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے۔

مجالس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبال کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا مبسوط بیان ہوتا۔ اقبال کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان، محفل علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی۔ کراچی کی بے آب وگیاہ وادی" میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا۔ وہ نخلستان جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے نخیل بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسلیان کوئی آدھے گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے۔ پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا۔ اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعہ اقبال میں مستغرق بحر قرآن کی غواصی کر رہا ہو تو کیا، اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو تو کیا۔ وہ

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

ہوتا ہے، دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر ہے۔ وقفہ چائے میں لطافت وظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی، وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد "شمع" پھر شیخ قلندران کے سامنے پہنچ جاتی، پرویز صاحب ہیں ان گزرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گرد راہ بن جاتے اور فلک زمین معلوم دیتے۔ اس جذب وانہماک میں "سفیر اقبال" زمین کے ہنگاموں کو نہ بھولتے اور انھیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیر اقبال کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبال کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ٹھیری، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انھیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انھیں معلوم ہوا کہ جب علم وفکر، قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اب اقبال کو سمجھا ہے۔ انھوں نے سمجھا ہی نہیں وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں۔ "سفیر اقبال" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ اب تک وہ پیام مشرق، ضرب کلیم، اور اسرار ورموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبال کی تیسیر فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضرب کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمہ میں مجلس قلندران کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے[1]۔

اس مجالس میں ضرب کلیم، بال جبریل، ارمغان حجاز (حصہ اردو) جاوید نامہ، اسرار ورموز، پس چہ باید کرد، بانگ درا، (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس رہا کہ کوئی مختصر نویس حتیٰ نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے

---

[1] اگرچہ یہ تعارف اور مقدمہ اس سے پہلے طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم ڈاکٹر عزام کی یاد میں انھیں کسی دوسرے وقت پھر قارئین کے سامنے لائیں گے۔ (طلوع اسلام)

کہا جا سکتا ہے کہ اقبال سے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور اس طرح کہا یا سنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبال پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جا سکتی۔ لیکن بقول غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سفیرِ اقبال نے دامن بھر بھر کے اس متاعِ فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ مجلس قلندراں ۔۔ ایک ختم کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آیندہ نشست میں ختم ہو جانا ہوتا تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے دراز رہتی یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیرِ اقبال اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے امتیازات ختم کر دیئے جاتے، ہر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیل مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ جاڑے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۸ دسمبر [illegible]ء کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی قلندر نے فکر مند ہو کر یہ سوچ لیا کہ سفیرِ اقبال پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو "منتشکل" کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندرانِ اقبال، جو نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لئے پھرتے تھے، اس کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا مگر چہرے سنجیدہ تھے۔ نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی	کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا	دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی

کشادم چشم و بربستم لبِ خویش
سخن اندر طریقِ ما گناہیست

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیرِ اقبال اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا۔ وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا۔ جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیامِ اقبال اور تعلیمِ قرآن ہی کے صدقے میں تھا، ورنہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل نا آشنا ہو رہی تھیں۔

یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اتفاق سے اس دن جس جاوید نامہ کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا جس کا عنوان ہے "در حضور رسالتمآب ﷺ"۔ ایک طرف اقبال حضور رسالتمآب ہیں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ اس کی کیفیت کیا

ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف شیخ قلندران اور سفیرِ اقبال۔ دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر وارفتہ کیفیت طاری تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفل سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے،[1] وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ اب جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے، وہ اسے اپنے لئے فردوسِ گوش بنا لیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیفیت بار وحیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حریم کعبہ اور صحن مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے۔ اور جب سے آنے والے دن، ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔　　　　(خورشید)

اس کے بعد سفیر صاحب (ہم انہیں ہمیشہ اسی لقب سے پکارا کرتے تھے) جدہ تشریف لے گئے اور اپنے ہر خط میں اس وعدہ کو دہراتے رہے کہ جونہی حالات مساعد ہوئے وہ تمام "قلندروں" کو دعوت دیں گے اور "ارمغانِ حجاز" کا مطالعہ اور ختم، حریم کعبہ اور صحن مسجد نبویؐ (علیہ التحیۃ والسلام) میں ہوگا۔ (اس دوران میں حالات ناسازگار رہے جن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں، وہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (منعقدہ لاہور) میں تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کی پہلے سے اطلاع دیدی اور تاکید سے لکھا کہ آپ کلوکیم میں ضرور آنا تاکہ ملاقات کے لئے کافی وقت مل جائے۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا اور میں گرمجوشی سے وہ ملے اس سے میرے سینے میں ابھی تک حرارت کا احساس باقی ہے۔ انہی کے ایما سے کلوکیم کے دوران میں، دیال سنگھ کالج ہال میں، "من و یزداں" کے عنوان پر میری تقریر ہوئی جس کی انہوں نے صدارت فرمائی۔ پھر یہیں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ کلوکیم کے بعد کراچی پہنچ کر ایک شام مختص کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مجلس "قلندران" کا انعقاد ہو جائے۔ ۴ جنوری ۱۹۸۱ء کی شام (سفارت خانے کے بجائے میرے کاشانے میں) اس مجلس کا انعقاد ہوا اور زمانے کی طنابیں چار سال پیچھے کو کھنچ گئیں۔ نہ معلوم ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس مجلس کا ریکارڈ بھی ٹیپ پر محفوظ کر لینا۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ رخصت کے وقت انہوں نے تمام قلندروں سے بچشم نم کہا کہ اب "حریم کعبہ" میں ملاقات ہوگی۔

کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات "حریم جنت" پر ملتوی ہو جائے گی! طوبیٰ لہٗ وحسن مآب۔

(پرویز)

---

[1] یہ تصویر طلوع اسلام بابت ماہ مارچ ۱۹۷۷ء کے ٹائٹل پر شائع ہوئی تھی　　(طلوع اسلام)

لاہور کا ایک علمی مذاکرہ

(پرویز صاحب کی بصیرت افروز تقریر)

نظارتِ دینیہ دعربک سوسائٹی، دیال سنگھ کالج، لاہور کی طرف سے ۱۷ جنوری، ۷ بجے دن کے لئے، ایک علمی مذاکرہ کا اعلان ہوا جس کا عنوان تھا "اسلام، سائنس اور علوم مشرق"۔ صدارت کے لئے جسٹس شیخ محمد شریف صاحب، سابق چیرمین اسلامک لاکمیشن، کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والوں میں ذیل کے اسمائے گرامی تھے۔

ڈاکٹر رفیق احمد خان ڈی۔ ایس سی (کینیڈا) پرنسپل دیال سنگھ کالج۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے ڈی لٹ پرنسپل اورینٹل کالج

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی

علامہ علاؤ الدین صدیقی صدر شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد باقر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی۔

اور مبصرین ہیں:۔

چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان (فاضل علوم سائنس)

سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔۔۔ مفکر اسلام۔

علامہ عنایت اللہ خان المشرقی۔ (ماہر علوم مشرق و مغرب)

چوہدری غلام احمد پرویز ۔۔۔ متکلم اسلام۔

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی۔

مولانا عبدالستار خان نیازی ۔۔۔ مجاہد اسلام۔

محترم پرویز صاحب کو اس کا علم اس وقت ہوا جب مذاکرہ سے ایک دن پہلے مطبوعہ پروگرام ان تک پہنچا۔ بابِ احمد دیال سنگھ کالج کے

طلباء سے سابقہ مراسم کی رعایت سے وہ شریک مذاکرہ ہوئے۔ لیکن صرف سبقر کی حیثیت سے۔ اجتماع، لاہور کی روایات کا آئینہ دار تھا۔ علاوہ مختلف کالجوں کے طلباء اور پروفیسر حضرات کے، شہر کے ارباب فکر و بصیرت کی اچھی خاصی تعداد بھی شریک اجتماع تھی اور ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ابھی ڈاکٹر رفیق احمد خان اور علامہ علاؤ الدین صدیقی ہی تقریر کر پائے تھے کہ صدر تقاریب (جنیبہ مرزا عبد المجید صاحب) نے یکایک اعلان کر دیا کہ اب چوہدری غلام احمد پرویز اپنے خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں گے۔ حاضرین کی طرف سے اس اعلان کا گرمجوشی سے استقبال ہوا۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اعلان غیر متوقع (اور پروگرام کے خلاف) تھا لیکن چونکہ یہ جناب علی کے، پرویز صاحب کے ساتھ ان مخلصانہ مراسم پر مبنی تھا جس کا انھوں نے اعلان کے ساتھ اظہار فرمایا تھا، اس لئے پرویز صاحب کے لئے مجال انکار نہ تھی۔ چنانچہ وہ اٹھے اور دس پندرہ منٹ کے اندر (جو وقت مقررین کے لئے طے شدہ تھا) برجستہ تقریر فرمائی جسے قارئین کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (ہم مرزا صاحب کے شکرگزار ہیں کہ ان کی بے تکلفانہ جسارت نے ہمیں پرویز صاحب کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع بہم پہنچا دیا)

صدر محترم و برادران عزیز!

اس مذاکرہ میں موضوع زیر بحث یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ سائنس سے مراد وہ علوم ہیں جن کی رو سے خارجی کائنات (اور خود انسان کی طبیعی زندگی) کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس تحقیق کا مدار ان معلومات پر ہوتا ہے جو حواس (senses) کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف جب ہم اسلام کے متعلق گفتگو کریں گے تو ہمیں اس کے اولین اور اساسی سرچشمہ قرآن کریم کی طرف آنا ہوگا۔ قرآن، علوم سائنس کی کتاب تو ہے نہیں کہ اس میں کیمیا اور طبیعیات کے فارمولے اور ایٹم بم بنانے کے طریقے درج ہوں۔ وہ ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح مقام سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا (سمٹ سمٹا کر) سوال کی شکل یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن، خارجی کائنات اور ادراک بالحواس (sense-perception) کے متعلق انسان کو کس قسم کا نقطۂ نظر دیتا ہے۔ کیا زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ ان مسائل کے متعلق اس کا (Attitude) کیا ہے۔ اگر وہ نقطۂ نگاہ سامنے آجائے تو اس سے اسلام اور علوم سائنس کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس باب میں قرآن کا نقطۂ نظر پیش کروں، چند الفاظ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نزول قرآن سے پہلے خارجی کائنات اور ادراک بالحواس کے متعلق دنیا کے مذاہب کا (Attitude) کیا تھا۔ اس پس منظر میں قرآن کا نقطۂ نگاہ زیادہ واضح طور پر سامنے آسکے گا۔

جب ہم علم و فکر کی تاریخ کے متعلق بات کریں گے تو ہماری نگاہ لامحالہ خطۂ یونان کی طرف اٹھے گی جہاں کے حکماء کو اس باب میں اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔ ان حکماء میں سقراط اور افلاطون کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ سقراط کے نزدیک خارجی کائنات اس قابل ہی نہیں کہ اسے کسی توجہ کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ انسان کے لئے مطالعہ کا موضوع خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ افلاطون اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ محسوس کائنات کا در حقیقت وجود ہی نہیں۔ حقیقی وجود عالم امثال

(World of Ideas) کا ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ اس عالم کا سایہ، بلکہ ہماری نگاہ کا فریب (Illusion) ہے۔ لہٰذا جو معلومات ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں، وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے۔

افلاطون کا یہ نظریہ اگر فلسفہ کی دنیا تک محدود رہتا، تو بھی کچھ زیادہ نقصان کا موجب نہ بنتا۔ لیکن یہ انسانیت کی بدبختی تھی کہ اس سے مذہب کی دنیا بھی متاثر ہو گئی کہ یہ نظریہ ان کے نزدیک عین حقیقت بن گیا۔ ہندو دھرم (بلکہ ان کے تصوف۔۔ ویدانت) کی رُو سے پراکرتی (مادہ) مایا (فریب) کا جال ہے۔ سراب ہے۔ کائنات ایشور کا خواب ہے۔ جب اس کی آنکھ کھل جائے گی تو ہستی اور اس کے تمام مناظر خود بخود معدوم ہو جائیں گے۔ کائنات کے متعلق اس تصور کا لازمی نتیجہ تھا کہ مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھا جائے۔ اس سے دور بھاگا جائے یہاں کی ہر شے کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہی مسلک مذہب کا منتہیٰ اور انسانی زندگی کا کمال سمجھا گیا۔

دنیا کے متعلق یہی تصور بدھ مت کی بنیاد ہے اور اسی پر عیسائیت کی عمارت استوار ہے۔ یہ تھا افلاطونی نظریہ کا اثر جس نے پوری کی پوری دنیائے مذاہب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کہ اتنے میں قرآن کا نزول ہوا اور اس نے طلسمِ افلاطون کی دھجیاں فضا میں بکھیر رکھ دیں۔ اس نے علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی پوری تائیدات کے ساتھ اس انسانیت کُش تصور کو چیلنج دیا اور حتم و یقین کے ساتھ للکار کر کہا کہ

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... (۳۸/۲۷)

ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ جو ایسا سمجھتے ہیں وہ حقیقت کا انکار کرتے ہیں

یہ انداز منفیانہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مثبت طور پر اعلان کیا کہ

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹/۴۴)

اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس میں حقیقت کو تسلیم کرنے والوں کے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔

کائنات کے متعلق یہ پہلی آواز تھی جو "مذہب" کے اسٹیج سے بلند ہوئی اور اس نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات حقیقت (Reality) ہے۔ فریبِ نگاہ نہیں ہے یہ اس قابل ہے کہ اس پر پوری سنجیدگی سے (Seriously) غور و فکر کیا جائے۔ یہ یونہی رائیگاں جانے کے لئے (باطل) پیدا نہیں کی گئی۔ اس کی تخلیق کے پیچھے بہت بڑا مقصد (purpose) ہے۔ یہ خواب نہیں۔ فی الواقعہ موجود ہے۔ جو اسے فریبِ نگاہ اور سراب سا سمجھتے ہیں وہ کافر ہیں۔ ان کا یہ نظریہ علم و حقیقت پر مبنی نہیں۔ ظن و قیاس پر مبنی ہے۔ ان کے برعکس، جو لوگ اسے حقیقت (Reality) سمجھتے ہیں، وہ مومن ہیں اور ان کے لئے اس میں حقائق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

کائنات کے متعلق (صحیح اور غلط) تصور کو کفر اور ایمان کا مدار قرار دینا، نہ صرف دنیا کے مذاہب بلکہ جہانِ فکر و نظر کے لئے بھی بڑی عجیب کی بات تھی۔ قرآن کی اس انقلاب آفریں آواز نے کاروانِ انسانیت کا رُخ ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ اس سے دنیا کو کیا کچھ حاصل ہوا، اس کے متعلق اربابِ فکر و بصیرت سے پوچھئے۔

کائنات کے متعلق اس قسم کا تصوّر دینے کے ساتھ قرآن نے علم کی ایک ایسی تعریف (Definition) پیش کی جس نے انسانوں کے سامنے ایک جہانِ نو کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ اور اس کے بعد علم کے متعلق کہا کہ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ اور بصارت اور فؤاد، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ جس بات کو علم کہہ کر پکارا گیا تھا اس کے ساتھ تمہاری تائید اور شہادت موجود تھی یا نہیں؟ اس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے، علم اُسے کہا جا سکتا ہے جس کے ساتھ سمع۔ بصر۔ اور فؤاد کی شہادت موجود ہو۔ قرآن سمع و بصر کا ذکر، حواس (senses) کے نمائندہ کی حیثیت سے کرتا ہے اور فؤاد وہ ہے جسے آج کی اصطلاح میں (Mind) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے ان ہر دو عناصر (senses And Mind) کو علم کی بنیادیں قرار دے کر کس طرح پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ سمع و بصر ادراک با لحواس (perceptual knowledge) کو محیط ہیں اور فؤاد (conceptual knowledge) کو حاوی۔ قرآن کا کہنا یہ ہے۔ کہ تم حواس کے ذریعے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرو اور پھر انہیں فؤاد کی بارگاہ میں پیش کر دو تاکہ وہ ان سے صحیح صحیح نتائج مستنبط کر سکے۔

یہ ہے، برادرانِ عزیز! کائنات کے متعلق وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا اور یہ ہے ادراک با لحواس کا وہ مقام جس کا اس نے تعین کیا۔ کائنات کے متعلق یہ تصور اور حواس کا یہ مقام آپ کو دنیا کے مذاہب میں کہیں نہیں ملے گا۔ یہ صرف قرآن کے پیش کردہ دین میں ملے گا۔ اس تصور سے انسان کی نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کو اپنے گہرے مطالعہ کا موضوع بنائے اور اس کے محیر العقول نظام پر غور و فکر کرے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن عقل و بصیرت اور ایمان و تقویٰ کا لازمی تقاضا قرار دیتا ہے وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اور رات اور دن کی گردش میں اربابِ عقل و بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے۔ ہر وقت، قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ارض و سما کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں کائنات کی ایک ایک چیز کو لیتے ہیں۔ اور اس کے متعلق ریسرچ کرتے ہیں اور علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰-۱۹۱)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کارگہِ کائنات کی کسی شے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ تمام سائنسدانوں تعمیری نتائج مرتب کرنے کیلئے

وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ نہ ہی بیکار ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

قرآن اپنے دعاوی کے اثبات کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) "ہم انفس و آفاق کی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے حتیٰ کہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ ایک حقیقت ثابتہ ہے"۔ مطلب اس کا صاف ہے۔ جوں جوں انسانی علم آگے بڑھتا اور بلند ہوتا جائے گا خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا کے راز ہائے سربستہ بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جو لوگ ان حقائق مستورہ کو یوں بے نقاب دیکھ لیں گے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا ایک ایک دعویٰ کس طرح سچا ہے۔ بالفاظ دیگر، قرآن کے دعاوی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت وہی لوگ ایمان لا سکیں گے جو خارجی کائنات اور انسانوں کی داخلی دنیا میں غور و فکر کریں گے۔

وقت نہیں ورنہ میں اس موضوع پر قرآن کریم کی بے شمار آیات آپ کے سامنے پیش کرکے اس حقیقت کو واضح سے واضح تر کرتا چلا جاتا کہ قرآن سائنٹفک ریسرچ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس کے نتائج کو کس طرح علم و ایقان کے استحکام کا موجب اور حق و صداقت کی تائید کا باعث قرار دیتا ہے۔

میں نے شروع میں بتایا تھا کہ قرآن کے نزدیک علم کی تعریف یہ ہے کہ اسے سمع و بصر اور فواد کی شہادت حاصل ہو۔ اسی کو علم سائنس کہتے ہیں۔ اب میں آخر میں ایک ایسی آیت پیش کرتا ہوں جس سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے علماء کا لفظ ٹھیک انہی لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے جنہیں ہم آج سائنسدان (scientists) کہتے ہیں۔ سورۂ فاطر میں ہے۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ (اپنے قانون طبعی کے مطابق) بادلوں سے بارش برساتا ہے فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا۔ پھر ایک ہی پانی (اور مٹی) سے قسم قسم کے پھل پیدا کرتا ہے جن کے رنگ جدا جدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ۔ زمین اور اس کی پیداوار ہی نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر تم نے پہاڑوں کی ساکت و صامت چٹانوں پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ ان میں رنگا رنگ طبقات کیوں ہیں؟ کوئی سفید۔ کوئی سرخ۔ کوئی کالا بھجنگ۔ اگر تم ان (پہاڑوں) سے پوچھو گے تو یہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ شاہراہ ارتقاء کی کون کون سی منزلوں سے گزرے ہیں جن کے نشانات مختلف طبقات کی شکل میں موجود ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ۔ اور اسی طرح یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ انسان، حشرات الارض اور مویشیوں کی الگ الگ قسمیں کیوں ہیں؟ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف "علماء" کا طبقہ ایسا ہے جو کائنات کے محیر العقول سلسلہ پر غور و خوض سے، قانونِ خداوندی کی عظمت اور ہیبت کے احساس سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ اور اس حقیقت کا علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کر لیتا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ۔ (۳۵/۲۸) یقیناً خدا کا قانون بڑے غلبہ اور سطوت کا مالک اور نشو و نما کو

تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنے کا ضامن ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ "علماء" کا لفظ کس مقام پر آیا ہے اور کن لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اقوامِ مغرب نے علوم سائنس میں اس قدر ترقی کی ہے لیکن اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں آج ساری دنیا اس بُری طرح ماخوذ ہے۔ تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کی بے پناہ قوتوں کو تو مسخر کر لیا لیکن ان کا استعمال مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کے مطابق نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ مستقل اقدار ان کے سامنے ہیں ہی نہیں۔ یہ اقدار عقلِ انسانی کی پیداوار نہیں۔ انسانی فکر انہیں پیدا کر نہیں سکتا۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب تک فطرت کی قوتوں کو قرآن کی راہنمائی میں صرف نہیں کیا جاتا دنیا جہنم کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتی۔

اس مختصر سے وقت میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا ملخص (Summary) یہ ہے کہ قرآن کی رو سے

جو قومیں تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں وہ (مقامِ مومن تو ایک طرف) مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس لئے کہ آدم وہ ہے جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز ہوں۔

اور جو آدم وحیِ خداوندی کا اتباع نہیں کرتا وہ يُفْسِدُ فِي الْأَرْضِ وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ کا مظہر رہتا ہے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مورد نہیں بنتا۔

مومن وہ ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی کی روشنی میں، نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے استعمال کرے۔ اس کا نتیجہ وہ جنتِ ارضی ہے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ وذالک الفوز العظیم۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیا؟

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵- بی گلبرگ کالونی — لاہور

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا ایک سال

سیکولر اسلام

(SECULAR ISLAM)

(خدا اور قیصر کی جدید تقسیم)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے جولائی ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) کے ایک رکن (مولانا محمد حنیف ندوی صاحب) کا ایک مقالہ بعنوان "دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں" شائع کر کے اس کے اختلافی مقامات پر تبصرہ کیا تھا۔ ان میں سب سے اہم مقام وہ تھا جہاں انہوں نے لکھا تھا کہ

> زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ اجتہاد کے دائروں کو وسیع کیا جائے اور مصرح اور غیر مصرح کی قید اڑا دی جائے اور دیکھا صرف یہ جائے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کی روشنی میں ان مسائل کو کیونکر حل کرنا ممکن ہے۔

ہم نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> فکر و اجتہاد کی صحیح آزادی کے معنی یہ ہیں کہ وحی نے (مصرح و غیر مصرح) جو کچھ عطا کیا ہے اسے غیر متبدل سمجھا جائے اور اس کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے فکر کو کامل آزادی دی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ محترم ندوی صاحب ہماری اس پر خلوص گزارش کو درخور اعتنا سمجھیں گے۔ اور انسانوں کے خود ساختہ طوق و سلاسل کو توڑنے کے جوش میں وحی کی تصریحات کو غیر مصرح کہنے کی حد تک نہ پہنچ جائیں گے۔ طائر فکر کے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ
>
> پر دو در وسعت گردوں یگانہ
>
> نگاہ او بہ شاخ آشیانہ

یہ شاخ آشیانہ، وحی (قرآن) ہے جو اپنی تصریحات اور غیر مصرح اصولات دونوں کا مجموعہ ہے اور ان دونوں میں کوئی

فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قرآنی تصریحات محض وقتی اور ہنگامی ہوتیں تو انہیں قرآن میں داخل ہی نہ کیا جاتا۔ قرآن میں صرف اصول دیئے جاتے اور ان کی تصریحات کو اسلامی نظام کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جاتا۔ ان تصریحات کا وحی کی رو سے متعین ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ بھی اساسی اقدار کی طرح غیر متبدل ہیں۔

ہماری اس تنقید پر ماہنامہ ثقافت کی متعدد اشاعتوں میں، ندوی صاحب کے قلم سے تاثرات کے تحت ایک مسلسل تبصرہ شائع ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا نقطہ کے متعلق انہوں نے جنوری ۲۰۰۸ء کی اشاعت میں، اپنے خیالات کی جو وضاحت کی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اسے انہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مزید برآں پرویز صاحب کے ان الفاظ سے غلط فہمی بھی پیدا ہوتی ہے کہ منصوص و غیر منصوص کی تقسیم منطقی ہے۔ یعنی قرآن مجید میں جن مسائل کا تذکرہ ہے وہ تو اصولی اور بنیادی ہیں۔ جن میں تغیر و تبدل کی قطعی گنجائش نہیں۔ اور جن مسائل کا ذکر نہیں ہوا ہے، وہ جزئیات ہیں۔ جن میں اسلامی معاشرہ کو قرآن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے تغیر و تبدل کا اختیار ہے۔ حالانکہ امر واقع ایسا نہیں۔ قرآن کی ترتیب تاریخی ہے منطقی نہیں۔ وہ تیئیس سال کے طویل عرصے میں حالات و ظروف کی مناسبتوں کے پیش نظر نازل ہوا ہے۔ جملۃً واحدۃً یا ایک مرتب و مدون کتاب کی شکل میں نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ
كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ وَلَا يَأْتُونَكَ
بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا　　(الفرقان)

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی وقت کیوں نہ اتارا گیا اس طرح آہستہ آہستہ اس لئے اتارا گیا کہ تمہارے دل میں تثبیت پیدا ہو اور اسی واسطے ہم اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔ اور یہ لوگ تمہارے پاس جو اعتراض کی بات لاتے ہیں۔ ہم تمہارے پاس اس کا خوب شرح اور معقول جواب بھیج دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس میں اس دور کے ذہنی، درجہ عقلی اور نفسیات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے، اور اس انداز سے قلب پیمبر پر نازل کیا گیا ہے۔ کہ جب کوئی خلش پیدا ہوئی، کوئی سوال ابھر کر سامنے آیا، یا کسی کو کوئی اعتراض سوجھا، یا حاجت ہی نے تقاضا اور سوال کی متعین صورت اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی کی غرض سے ایک آیت، ایک سورۃ یا چند آیات نازل ہوتیں۔ اور ان مشکلات کو حل اور گتھیوں کو آن کی آن میں سلجھا دیا جاتا۔ اس میں ابواب و فصول، اور فصلین کی معنوی ترتیب پائی نہیں جاتی اور نہ بنیادی اور اساسی مسائل ہی کی کوئی تخصیص کارفرما ہے۔ بلکہ جیسے جیسے مسائل و حالات نے کروٹ بدلی اور جس جس اسلوب سے شکوک و شبہات پیدا ہوتے گئے اسی مناسبت سے ان کے بارے میں احکام و تفصیلات کا نزول ہوتا رہا۔ یعنی بنیادی اور غیر بنیادی کی تفریق تسلیم کئے بغیر جب کبھی کسی سوال نے اہمیت حاصل کر لی قرآن حکیم

اس کے جواب سے بہر حال عہدہ برآ ہونا ہی پڑا۔ یہی سبب ہے کہ اگر کسی نے روح کی حقیقت پوچھ لی۔ جو بلاشبہ فلسفہ ودین کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ تو اس کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچایا

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○ اسرائیل

اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔

اور اگر کسی نے حیض کا مسئلہ دریافت کر دیا کہ جس کا تعلق سراسر اور صحت سے ہے اور جس کو ہر کوئی جانتا ہے تو اس جلیل القدر کتاب کو اس کی بھی وضاحت کرنا پڑی۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ

اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ تو نجاست ہے۔ سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔

پھر علاوہ ان داخلی شہادتوں کے، جن کو اس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے یہ اس لئے بھی قرین قیاس ہے کہ ایک ایسا معاشرہ، جو صدیوں سے علوم کی صیقل گری سے محروم ہو۔ ایک مرتب کتاب سے کیونکر استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کی اصلاح تو لامحالہ ایسی ہی کتاب سے ممکن ہے جو ان کی نفسیات اور ضروریات کے مطابق وقتاً فوقتاً تدریجاً نازل ہو۔ اور اس کے مضامین کا تنوع اور بوقلمونی، اس کے ذہن وقلب کی آوارگیوں کو، اپنی طرف جذب کر لینے میں کامیاب ہو سکے۔ اور قرآن کی فتوحات اور کامیابیوں کا راز اسی نکتہ میں پنہاں ہے کہ اس نے اس نزاکت کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس تجزیہ سے اگر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے، کہ قرآن کی ترتیب علمی وعقلی نہیں بلکہ تاریخی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے مسائل میں منصوص وغیر منصوص کی تقسیم موثر وسمجھ میں آنے والی نہیں بلکہ اس کے بجائے قابل فہم تقسیم یہ ہے کہ جن آیات کا تعلق عقائد وعبادات سے ہے، وہ تو اصولی اور بنیادی ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ اسی طرح ان سے متعلقہ مسائل وجزئیات کی حیثیت بھی غیر متبدل ہے۔ جو تعبیدات کے نقشے اور ڈھانچے کو واضح کرتی ہیں۔ لیکن وہ آیات جو سوسائٹی اور معاشرہ کے تہذیبی وعمرانی مسائل سے تعرض کرتی ہیں ان کی نئی تعبیر قرآن ہی میں مذکور نسبتاً زیادہ وسیع، زیادہ جامع اصولوں اور معیاروں کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ اور ان کے رخ اور مزاج کو حالات وظروف کے تقاضوں کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔

اصل مصیبت یہ ہے کہ کچھ اہل علم کے ذہنوں میں یہ بات اب تک نہیں آپائی کہ معاشرہ ساکن نہیں ہے اور اس میں

تغیر وارتقاء کا عمل جاری وساری ہے۔ اور جس طرح ایک مادی معروض طبیعاتی قوانین کا پابند ہوتا ہے، اور طبیعی عوامل سے متاثر ہوتا اور مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرہ اور سوسائٹی ایسی تبدل پذیر حقیقت ہے کہ جس پر طبیعی عوامل اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں جو ارتقاء کی اس ناگزیر رفتار کو روک سکے۔ یہ عوامل حیاتیاتی بھی ہیں اور صناعی وفنی (Technological) بھی۔ اجتماعیات سے متعلق بھی ہیں اور دینیاتی یا نظریاتی بھی۔ اقتصادی بھی ہیں، اور ایسے داخلی اور فطری بھی کہ جن کو خود معاشرہ جنم دیتا رہتا ہے۔ یہ عوامل کس انداز میں اثرانداز ہوتے ہیں اور کیونکر معاشرہ کے مزاج کو بدلتے اور اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بحث ہے جس سے عمرانیات کا ہر طالب علم آشنا ہے۔ اس لئے ہم اس کی تفصیلات میں جانے کے لئے تیار نہیں۔ البتہ ان نتائج کی طرف ضرور توجہ دلانا چاہتے ہیں جو منطقی طور پر اس سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ ایک ایسی حقیقت سے تعبیر ہے جو ارتقاء کی راہ پر گامزن ہے۔ جو شئون وحالات کی ان گنت کیفیتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ اور جو سکون وقرار سے متنفر اور حرکت وتغیر پر ہمہ رجحان سے فریفتہ ہے تو قانون کی کوئی شکل ہمکل اور آئین کی کوئی صورت جامع نہیں ہو سکتی۔ چاہے یہ قانون ایسا ہو کہ انسانی عقل وخرد نے اسے وضع کیا ہو۔ اور سوسائٹی کی دنیوی اور مادی ضروریات نے اسے پیدا کیا ہو، اور چاہے یہ آئین کسی الہامی کتاب سے ماخوذ ہو۔ قانون وآئین کی فطرت کا بہرحال تقاضا یہ ہے کہ حالات کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں معقول تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ —— اور انسان بحیثیت مجموعی ٹھہراؤ اور سکون کا شکار ہوئے بغیر خیر وجمال کی طرف بڑھتا رہے، اور فلاح وبہبود کی زیادہ سے زیادہ مقدار سے بہرہ مند ہوتا رہے۔

ندوی صاحب نے اپنے مسلک کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی پوزیشن یہ نہیں کہ خدائے علیم وخبیر نے تمام نوع انسانی کے قیامت تک کے زندگی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسا ضابطہ حیات عطا کیا ہو جس میں نہ کسی ترمیم وتنسیخ کی ضرورت ہو اور نہ کسی حک واضافہ کی گنجائش۔ اس کی پوزیشن یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے مخاطبین نے جس جس بات کے متعلق کچھ دریافت کیا، انہیں اس کا جواب دے دیا گیا۔ وہ سوالات بھی اُن لوگوں کی عقلی اور علمی سطح کے مطابق تھے اور ان کے جوابات بھی لامحالہ انہی سطح کے مطابق۔ لہٰذا ایسی کتاب کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں تمام نوع انسانی کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے راہ نمائی موجود ہے، اس کتاب کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ اس میں

جن آیات کا تعلق عقائد وعبادات سے ہے وہ تو اصولی اور بنیادی ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ اسی طرح ان سے متعلقہ مسائل وجزئیات کی حیثیت بھی غیر متبدل ہے جو تعبدیات کے نقشے اور ڈھانچے کو واضح کرتی ہیں۔ لیکن وہ آیات جو سوسائٹی اور معاشرہ کے تہذیبی وعمرانی مسائل سے تعرض کرتی ہیں..... ان کے رُخ اور مزاج کو حالات وظروف کے مطابق بدلا جا سکتا ہے..... قانون خواہ وہ کسی الہامی کتاب ہی سے ماخوذ کیوں نہ ہو، حالات کی رفتار کے ساتھ

ساتھ اس میں معقول تبدیلیاں رونما ہوتی رہنی چاہئیں۔

جو کچھ ندوی صاحب نے کہا ہے اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نماز۔ روزہ (عبادات) کے متعلق قرآن نے جو کچھ اصولی یا فرعی حیثیت سے دیا ہے، اس میں تو کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس نے جو احکام معاشرتی اور عمرانی معاملات کے متعلق دیئے ہیں۔ خواہ وہ اصول کی شکل میں ہوں اور خواہ جزئیات کی صورت میں۔ ان میں زمانے کی رفتار کے ساتھ تبدیلی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ مثلاً

(۱) قرآن نے ان عورتوں کی فہرست دی ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے۔ چونکہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے (نہ کہ "عبادتی") اس لئے اس فہرست میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی حالات کا تقاضا ہو تو بہن۔ بیٹی۔ خالہ۔ پھوپی سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔

(۲) قرآن نے جنسی تعلق کے لئے نکاح کو ضروری قرار دیا ہے لیکن چونکہ یہ معاشرتی معاملہ ہے اس لئے اگر زمانے کی رفتار کا ایسا تقاضا ہو تو جنسی روابط کے لئے اس شرط کو بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۳) قرآن نے خنزیر۔ خمر۔ میسرہ۔ ربوٰ کو ممنوع قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ معاشرتی مسائل سے متعلق احکام ہیں اس لئے انھیں ابدی طور پر غیر متبدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔

(۴) قرآن نے عدل کا اصولی حکم دیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق معاشرتی اور عمرانی معاملات سے ہے۔ اس لئے عند الضرورت اس اصول میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

ہمارے نزدیک قرآن کے متعلق اس قسم کا تصور، قرآن سے کھلا ہوا انکار ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) "اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں" تو کلمات اللہ میں صرف عبادات سے متعلق احکام ہی شامل نہیں۔ اس میں وہ تمام اصول اور جزئیات شامل ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اس نے جب اعلان کیا ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق معاملات کے فیصلے نہیں کرتا تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں" تو اس سے اس کی مراد "عبادات" کے فیصلے نہیں۔ زندگی کے تمام معاملات کے فیصلے ہیں جن کے متعلق قرآن نے اصولی یا تفصیلی احکام و قوانین دیئے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن کے کسی ایک قانون میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے وحی کی ابدیت سے کھلا ہوا انکار ہے۔ اور یہ سمجھنا کہ قرآنی احکام کے ایک حصے میں تو تبدیلی کی جا سکتی ہے اور دوسرے حصے میں نہیں، وہی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (۲/۸۵) "کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟" قرآن نے اس ذہنیت کا لازمی نتیجہ "اس دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں شدید عذاب" بتایا ہے۔ پھر اس تقسیم میں عبادات سے متعلق احکام کو غیر متبدل اور تمدن و معاشرت سے متعلق احکام کو قابلِ تغیر و تبدل قرار دینا، عیسائیت کی وہی ثنویت (Dualism) ہے جس کی رو سے "خدا کا حصہ خدا کو اور قیصر کا قیصر کو" دیا جاتا ہے۔ قرآن اس قسم کے تصورات کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

ندوی صاحب نے نہ تو اپنے اس دعوے کی تائید میں کوئی قرآنی سند پیش کی ہے کہ قرآن کے اصول یا جزئیات میں تبدیلی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی "تعبدیاتی" اور غیر تعبدیاتی احکام کی تفریق کی تائید میں۔ وہ اس باب میں قرآن سے کوئی سند پیش ہی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے (بزعم خویش) عقلی دلیل پیش کی ہے کہ قانون کو (خواہ وہ وحی پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو) زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک، ان کے اس نظریہ کے مقابلہ میں، مغرب کے مادہ پرست معقولیین (Rationalists) کا نظریہ کہیں زیادہ "معقول" ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہئیں۔ اسے کسی ماورائے عقل سرچشمہ سے راہ نمائی کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ ندوی صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر وحی کی راہ نمائی کو چند قدم پر جا کر زمانہ کا ساتھ چھوڑ دینا ہے اور وہاں پھر روشنی عقل ہی سے حاصل کی جاتی ہے، تو پھر اس تکلف کی ضرورت کیا ہے کہ شروع میں وحی کی راہ نمائی پر ایمان رکھا جائے اور چند قدم کے بعد اسے چھوڑ کر عقل کی راہ نمائی اختیار کر لی جائے۔ کیوں نہ شروع ہی سے عقل کا اتباع کیا جائے؟ ــــــ لیکن یورپ کا آزاد دہریہ، ہمارے ہاں کے "خدا پرستوں" کی مجبوریوں کو کیا جانے! اسی مجبوری کا غماز ندوی صاحب کے تبصرہ کا وہ حصہ بھی ہے جہاں وہ (اپنے تاثرات کی آخری سطروں میں) اطاعت رسولؐ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس سطح بیں طبقہ تو شاید خوش ہو جائے (کہ ندوی صاحب اطاعتِ رسول کو اتنی اہمیت دیتے ہیں) لیکن علم و عقل رکھنے والا طبقہ اس پر ہنسے گا کہ جب رسول اللہؐ کے فیصلوں کی ابدیت بھی (قوانین خداوندی کی طرح) تعبدیات تک ہی محدود ہے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں حضورؐ کے فیصلے قابلِ تغیر و تبدل ہیں تو اس قسم کے اتباعِ سنت کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔

بہر حال یہ ہے ندوی صاحب کا نظریہ قرآن کے متعلق۔ ہم ان کے ان خیالات کو چنداں اہمیت نہ دیتے (کیونکہ یہ نہ قرآن پر مبنی ہیں نہ علم و بصیرت پر) لیکن ایک اور خدشہ ہے جس کے پیش نظر ہم نے اس سوال کو سامنے لانا ضروری سمجھا ہے۔ ندوی صاحب جس ادارے سے متعلق ہیں اور جس کے آرگن میں ان کے یہ خیالات شائع ہو رہے ہیں (یعنی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ) وہ حکومت کی زیر سرپرستی چل رہا ہے۔ (اسے حکومت کی طرف سے گرانٹ ملتی ہے) اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اس ادارہ کے کام اور خیالات کو بہ نگاہِ تحسین دیکھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ (زود یا بدیر) ہمارے ہاں آئین سازی کا سوال سامنے آئے گا۔ اگر ہمارے ارباب حل و عقد بھی ان خیالات کے مؤید یا ان سے متاثر ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا دائرہ مساجد کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق قوانین آزادانہ طور پر مرتب کئے جائیں گے۔ اس لئے کہ جب قرآن کے متعلق نظریہ یہ ٹھہرا کہ اس کے اصول ہوں یا جزئیات، زمانے کی رفتار کے ساتھ ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے تو پھر آئین و قانون سازی کے سلسلے میں ایک اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک سیکولر (secular) اور دینی حکومت میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ سیکولر حکومت کے نزدیک کوئی اصول یا قانون غیر متبدل نہیں ہوتا اور دینی حکومت اس کی پابند ہوتی ہے کہ اس کے قوانین و ضوابط احکام خداوندی سے نہ ٹکرائیں خواہ ان کا تعلق "تعبدیات" سے ہو اور خواہ دنیاوی معاملات سے۔

قبل اس کے کہ اس ضمن میں کچھ اور کہا جائے، ہم ادارہ ثقافت اسلامیہ کے محترم ڈائرکٹر سے درخواست کریں گے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس باب میں ادارہ کا مسلک کیا ہے؟ یعنی اس کے نزدیک قرآن میں بیان شدہ احکام ۔۔۔ اصول و جزئیات ۔۔۔ کی پوزیشن کیا ہے؟ کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں یا اُن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ فیصلہ تمام احکام کے متعلق یکساں ہوگا یا اس سلسلہ میں تعبداتی اور معاشرتی احکام میں تفریق کی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر ادارہ کا مسلک واضح اور دو ٹوک انداز میں بیان کیا جائے گا تاکہ کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

طلوعِ اسلام جو کچھ کر رہا ہے

کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ قرآنی فکر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو؟

اگر آپ اس سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کے ساتھ تعاون کیجئے ۔۔۔۔۔ طلوعِ اسلام آپ سے

کوئی چندہ نہیں مانگتا ۔ کوئی عطیہ نہیں چاہتا

وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی کتابیں براہ راست ادارہ کے دفتر سے خریدیں، اس سے وہ کمیشن بچ جاتا ہے جو اسے دوکانداروں کو دینا پڑتا ہے۔

اس کی بہترین شکل یہ ہے

کہ آپ ادارہ کے پاس ایک سو روپیہ (یک مشت یا کم از کم دس روپے ماہوار کی قسطوں میں) پیشگی جمع کرا دیں۔

آپ کو ہر وہ کتاب جسے آپ اپنا پسند کریں

گھر بیٹھے ۔۔۔ بلا محصول ڈاک

مل جائے گی۔ اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی ۔۔۔۔۔ اور ادارہ کا فائدہ قرآنی مشن کا فائدہ ہے ۔۔۔ کسی فرد کا نہیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ ۔۔۔ بی ۔۔۔ گل برگ

لاہور

ملکیتِ زمین

(تاریخ کی روشنی میں)

زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں، آج کل اخبارات میں پھر یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ملکیتِ زمین کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ اس باب میں قرآنِ کریم کا فیصلہ کیا ہے، اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے (یعنی یہ کہ زمین تمام انسانوں کی پرورش کا ذریعہ ہے جس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اس محاذ پر شکست کھا کر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ قرونِ اول میں زمین پر انفرادی ملکیت کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ دین میں تاریخ کا مقام کیا ہے، اس کے متعلق بھی طلوعِ اسلام میں کئی بار لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ہم سے باصرار و تکرار کہا جا رہا ہے (اور متعدد گوشوں سے یہ استفسارات موصول ہو رہے ہیں) کہ ہم تاریخ کی روشنی میں بھی اس مسئلہ کا جائزہ لیں۔ ان حضرات کو غالباً یاد نہیں رہا کہ طلوعِ اسلام میں اس عنوان سے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ اس کی اپریل ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں، ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا،

مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کی ابتداء
تاریخ کی روشنی میں

لیکن چونکہ اس مقالہ کو شائع ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض مستفسرین کی نظروں سے وہ نہ گزرا ہو۔ ہم ان کے اصرار (اور مسئلہ کی اہمیت) کے پیشِ نظر، اس مقالہ کا وہ حصہ پھر سے شائع کرتے ہیں جس کا تعلق زمین کی ملکیت سے ہے۔ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمینِ عرب تھی۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدینۂ منورہ کی سرزمین تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ پانی کی قلت بلکہ میلوں تک نایابی کی بنا پر سرسبزی کہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پورے جزیرہ نما میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جا سکتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جَو کے چند کھیت نظر آ سکتے تھے۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں پنجاب کے باغات

اور کھیتوں کا تصور ذہن میں نہ لے آئیں مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے چند درخت لگا دیئے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کے لئے وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جا سکے یا جو حیثیت اس کو عہد رسالت میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع و عریض سنگستان ہے جو حرہ کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بنجر ہے۔ باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگائے جا سکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں قابل زراعت ٹکڑے آ جاتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اولین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں رکھئے اور سوچئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ عہد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے لئے وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بمشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں۔ یہ لوگ خود ہی اپنے ہاتھوں سے ان میں کام بھی کرتے تھے۔ زمین کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً مروج نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے کسان۔ کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے زمینداروں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں میں مبارزت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دو دو ہاتھ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ اور جواب میں یہی کہا کہ ہم ان کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسرشان سمجھتے ہیں۔ ابوجہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی تھا کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے۔

كَانَ يَشْغَلُهُمْ عَمَلُ أَرَاضِيهِمْ

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

مدینہ منورہ کے دو اہم قبیلوں اوس اور خزرج میں سے قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔

(کتاب الکسب للسرخسی ضمیمہ مبسوط صفحہ ۲۴۵ ج ۳۰)

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے۔

كُنَّا أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ مُزْدَرَعًا ۔ (بخاری)

تمام انصار میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہرحال اگرچہ چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربرآوردہ لوگوں

طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیرؓ (حضرت خدیجؓ کے چچا) کا یہ قول موجود ہے۔

> رسول اللہؐ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کیا کرتے ہو۔

وہاں سے واپس آکر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں۔

> میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور ظہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی ہے۔ (صحاح ستہ)

رافع ابن خدیجؓ اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں :۔

> میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔ (کنز العمال صفحہ ۔)

شمس الائمہ سرخسیؒ نے امام محمدؒ کے حوالہ سے اسید بن حضیرؓ صحابی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

> اے بنو حارثہ والو! آج تم پر بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پر زمینوں کا بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرمادی ہے۔ (مبسوط صفحہ ۲۳)

رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

> رسول اللہ صلعم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پہ بندوبست کرنے سے منع کردیا ہے (بخاری)

کہیں ان الفاظ میں ہے

> رسول اللہ صلعم نے منع فرمادیا ہے کہ زمین کو بندوبست کرکے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں

> رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا تھوڑا بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں لے سکتا؛ فرمایا گیا۔ نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہیں بھوسا تو لے سکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ (نسائی)

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

> زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بندوبست کرنا جائز نہیں ہے (ابوداؤد و مسند احمد و کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے معاوضہ میں دیدیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیجؓ رسول اللہ صلعم سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں

> دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کرایہ پہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہیل ان سے آکر عرض کرتے ہیں۔

کہ وہ احسان ایں منے وہ سود ہم پر اپنی زمین کرایہ پر دے دی ہے ۔

تو وہ بایں الفاظ ان کو منع فرما دیتے ہیں

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلعم نے زمینوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا اس لئے صراحۃً حضورؐ سے اس کی ممانعت مروی نہیں تھی ۔ لہذا کبھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلعم نے صراحۃً منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اصول ممانعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرما دیتے تھے ۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیجؓ سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ

سونے چاندی پہ بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا

بہرحال جہاں رافع ابن خدیجؓ سے اس کی اجازت نقل کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا قول ہے رسول اللہ صلعم کا نہیں ۔ رہی یہ بات کہ بعض روایتوں میں رافع ابن خدیجؓ نے اس اجازت کو رسول اللہ صلعم کی طرف بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے ۔

دراصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی نے کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلعم کا حکم معلوم ہوتا ہے ۔ (فتح الباری صفحہ ۲۰ ج ۵)

رافع ابن خدیجؓ کے علاوہ اسی مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں ۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہے ۔

کچھ صحابہ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں ۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخشش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے ۔ (بخاری مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں ۔

عطا جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیا کرتے تھے ۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخش دے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے

(بخاری مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی قسم کے الفاظ منقول ہیں اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابت اور ثابت ابن الضحاک اور ابو سعید خدری سے بھی نقل کی جاتی ہیں ۔ (ملاحظہ ہو مسلم ، ابو داؤد ۔ طحاوی وغیرہ)

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں صورت حالات کیا تھی ۔ زمین ہے ہی اس لئے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں ۔ غذا پیدا کرنے کے لئے یہ زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور رہیں گی ورنہ وہ خود پڑی پڑی غذا اگلنے سے رہیں چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آرہی تھیں آپ نے ان کو انہی کے تحویل میں رہنے دیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے ۔

مدینہ منورہ میں صرف بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلعم کو اس کا علم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند فرما دیتے ہیں بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں کرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بندوبست کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا۔ لہذا اس کی ممانعت صراحۃً آپ سے نقل نہیں کی گئی لیکن نھی عن کری الارض نھی عن المخابرۃ وغیرہ عمومی ارشادات سے اس صورت کا حکم بھی صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کے لئے دیا جائے یا روپیہ پیسہ پر دونوں جگہ ایک ہی ہے لہذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیجؓ نقد بندوبست کے متعلق حضورؐ کی ممانعت کی نفی کرتے ہیں جس کی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں اور استدلال میں حضور کا وہی عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضورؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بو بھی نہیں آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعہ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اسی واقعہ کا تذکرہ امیر جماعت اسلامی سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمرؓ کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ اور انس بن مالکؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزور شمشیر مغلوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدھے علاقہ کو حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقہ کو ۱۸ قطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بحساب ۱۰۰ آدمی فی قطعہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۱۵۰۰ حصہ دار تھے جن پر ۱۸ قطعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدہ کے مطابق ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہراتؓ کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں

وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانے سے ملتا آرہا ہے اور چاہیں اپنے حصے کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواجِ مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیماء اور اریحا میں بسا دیا (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہدِ خلافت و نبوت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیبر میں تھا اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا۔ (مسئلہ ملکیت زمین)

امیر جماعتِ اسلامی کی اس دلیرانہ جسارت پر ہم کیا کہیں؛ انہیں شاید معلوم ہو کہ یہی واقعہ خیبر ہے جس سے لفظ مخابرہ بنایا گیا ہے۔ مخابرہ کے معنی ہوتے ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاحِ ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابت، جابر ابن عبد اللہ، رافع ابن خدیجؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک نقل کر چکے ہیں کہ نهی رسول اللہ صلعم عن المخابرۃ جس کا ترجمہ ہوا "رسول اللہ صلعم نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ ـــ یہ روایت متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہ سے خود صحیحین میں موجود ہیں۔ ان روایات میں مخابرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس معاملہ ہی کے پیشِ نظر عربی زبان[ل] میں اسی وقت سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ یہ بھی بتا رہا کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا ورنہ مخابرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں محاقلہ مزارعہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔ رسول اللہ صلعم شاید سمجھتے ہوں گے کہ میرے بعد امت میں ایسے ایسے "عالم" بھی پیدا ہوں گے جو اسی ایک واقعہ کو نظیر بنا کر امت میں جاگیرداری و زمینداری کو فروغ دیں گے۔ انہی لوگوں کے استدلال کی جڑیں کاٹنے کے لئے آپ نے صاف طور پر خیبر کا نام لے کر ممانعت فرمائی کہ خیبر جیسا معاملہ تم دوسری جگہ پر نہ کر بیٹھنا کیونکہ اس کی حیثیت مزارعت کی نہیں ہے بلکہ قطعاً دوسری ہے۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ خیبر کے معاملہ کی وہ دوسری حیثیت کیا تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ سے اس دوسری حیثیت کا علم بھی ہمیں حاصل ہو جائے جیسا کہ ذرا آگے چل کر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یقینی طور پر معلوم نہ بھی کر سکیں، لیکن جب متعدد سندوں کے ساتھ خود صحاح میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "خیبر جیسا

لہ اگر مودودی صاحب کو خود اس کا علم نہیں تھا تو کم از کم ترجمان القرآن (صفحہ ۱۲۵) جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء میں حکیم صدیقی (مرحوم) کا یہ نوٹ ہی ملاحظہ فرما لیا ہوتا جس میں آپ دیکھ سکتے ہیں ـــ "مخابرہ کا لفظ خیبر ہی سے لیا گیا ہے اور اس سے معاملۂ خیبر مراد لیا جاتا ہے اور بعد میں یہ لفظ مزارعت (بٹائی) کا مترادف بن گیا ہے" ۱۲ صدیقی"

معاملہ کرنے سے آپ نے ممانعت فرمائی اس واقعہ کو بطور دلیل و استنباط کے پیش کرنا دیدہ دلیری نہیں تو اور کیا ہے۔ اس معاملہ کی وہ دوسری حیثیت ابوبکر رازی نے شرح مختصر الطحاوی میں اس طرح نشاندہی کی ہے۔

> آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی نہیں لیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلا وطن کر دیا۔ اگر یہ جزیہ نہ ہوتو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان سے ضرور جزیہ لیا جاتا۔ (بحوالہ عینی شرح بخاری صفحہ ۲۴)

اس کے جواب میں مودودی صاحب کا یہ ارشاد قطعاً قابل التفات نہیں کہ

> جو لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا نہیں بلکہ جزیہ کا معاملہ تھا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے ڈھائی تین سال بعد آئے ہیں اور یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے کہ حضورؐ نے سورۂ توبہ کی آیت جزیہ کے نزول سے پہلے کسی ذمی پر جزیہ لگایا ہو۔ (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۴۵)

امام رازی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ بعینہٖ جزیہ ہی تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جزیہ کے طور پر کوئی ٹیکس تھا۔ جزیہ کی آیت اگر خیبر کے ڈھائی تین سال بعد بھی نازل ہوئی ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس آیت سے پہلے اس قسم کا کوئی ٹیکس لگانے کی ممانعت تھی۔ کیا رسول اللہ صلعم کو اپنے اجتہاد سے کچھ کرنے کی ممانعت تھی۔ کیا نماز کی فرضیت سے پہلے (جو بقول مقلدین روایات شب معراج میں فرض ہوئی) آپ نماز جیسی کوئی عبادت نہیں کرتے تھے؟ کیا رمضان کی فرضیت سے پہلے (جو سنہ ۲ھ میں ہوئی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے نہیں رکھتے تھے اور مسلمانوں سے روزے نہیں رکھواتے تھے؟ کیا زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے چندہ کے طور پر بھی مسلمانوں سے کچھ بھی نہیں لیا جاتا تھا؟ کیا سورۂ انفال کے نازل ہونے سے پہلے جس میں اموال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے رسول اللہ صلعم نے جنگ بدر کا مال غنیمت خود تقسیم نہیں فرمایا تھا؟ کیا فدیہ کے جواز نازل ہونے سے پہلے ہی رسول اللہ صلعم نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینا منظور نہیں فرما لیا تھا؟ اس قسم کی مثالیں کہاں تک گنائی جائیں۔

مودودی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ اگر معاملۂ خیبر درحقیقت معاملۂ مزارعت ہی تھا تو رسول اللہ صلعم نے اور آپ کے بعد شیخین رضی اللہ عنہما نے یہود خیبر پر آیت جزیہ نازل ہو جانے کے بعد جزیہ کیوں نہیں لگایا۔ ہمارے نزدیک پہلی صورت اس دوسری نارواصورت سے کہیں بہتر ہے اور امام رازی کا مذکورہ بالا خیال قرین صواب ہے۔

اس کے باوجود ہمیں اس پر بھی اصرار نہیں ہے کہ یہ جزیہ ہی کا معاملہ تھا یا کچھ اور تھا۔ لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس کی کچھ دوسری حیثیت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلعم نے خاص طور پر متنبہ فرما دیا تھا کہ خیبر جیسا معاملہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھئے کہ خیبر کی جو زمینیں فتح ہوئی تھیں وہ صرف آٹھ قلعوں پر مشتمل تھیں۔ ناعم۔ قموص۔ شق۔ نطاۃ۔ کتیبہ۔ وطیح۔ سلالم۔ اور حصن الصعب بن معاذ۔ جس میں سے تین قلعے کتیبہ، وطیح اور سلالم مملکت کی ملکیت قرار پائے۔ کتیبہ بحیثیت خمس غنیمت کے

اور طلوع اسلام بحیثیت مال خمس کے ، باقی پانچ قلعے اٹھارہ سو سہام پر بانٹ کر پندرہ سو آدمیوں میں تقسیم کئے گئے ۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کیا ان کا رقبہ تھا اور کتنے لوگ اس میں شریک ہوئے اور ہر شخص کے حصہ میں کتنی کتنی زمین آئی ہو گی ۔

یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔

(۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے سے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں ۔

(۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکز ملت کی طرف سے ضرورت مند مسلمانوں کو عطا ہوئیں ۔

(۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہو سکتی تھیں ۔

(۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے ۔

(۵) بٹائی پر زمینیں دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلعم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس فاضل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں ۔

(۶) حضرات صحابہؓ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہو گا۔ اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورت مندوں کو فوراً دیدی گئی ہوں گی ۔

(۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے ۔

(۸) مرکز ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے ۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے ۔

(۹) خیبر کی زمینیں مسلمانوں پر تقسیم کر دی گئی تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ نہ تھیں ۔

(۱۰) خیبر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکز ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئی تھیں مگر یہ معاملہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا ۔

(۱۱) چونکہ خیبر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم نے صراحت کے ساتھ صحابہؓ کو خیبر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرما دی تھی ۔

یہ ہے اس مقالہ کا متعلقہ حصہ جو اپریل ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا اس ضمن میں مزید معلومات کے لئے اس مقالہ کا مطالعہ کیجئے جو زرعی نظام کے عنوان سے طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے ۔

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اس کے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات کا مجموعہ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں ۔

قیمت ـــ دو روپے ـــ ملنے کا پتہ :۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵ ـ بی ـ گل برگ ـــ لاہور

باب المراسلات

۱۔ تاریخ اور قرآن

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جنوری ۱۹۸۰ء کے طلوع اسلام میں آپ نے تاریخ اور قرآن کے عنوان سے جو شذرہ لکھا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا پُرمغز، حقیقت کُشا اور دین کے سمجھنے میں صحیح راہ نمائی دینے والا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ کم از کم ہمارے پہلے دور (عہد محمد رسول اللہ والذین معہ) کی تاریخ کے اُن واقعات کو بھی سامنے لاتے جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں اور اس لئے اس قابل نہیں کہ انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اگر آپ اتنی تفصیل میں نہیں جا سکتے تو مثال کے طور پر کچھ واقعات ایسے بیان کر دیجئے جن سے اس امر کی وضاحت ہو جائے۔ یہ چیز میری طرح اور بہت سے قارئین کے لئے بڑے فائدے کا موجب ہوگی۔

طلوع اسلام ہم اس سے متفق ہیں (اور اس چیز کی اہمیت کو کئی بار سامنے لا چکے ہیں) کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کم از کم، قرن اوّل کی تاریخ کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیں اور ان تمام واقعات کو، جو قرآن کی تعلیم کے خلاف جاتے ہیں، تاریخ سے خارج کر کے اسے از سرِ نو مرتب کریں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اوّل تو یہ کام کسی ایک فرد یا ادارہ کے کرنے کا نہیں۔ پوری ملت کے کرنے کا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوشش اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب اس قسم کی تاریخ مرتب ہو جانے کے بعد، سابقہ کتب تاریخ کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر اس جدید تاریخ کو دنیا میں رائج کیا جائے۔ اور یہ کام بین الملی حیثیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی ادارہ اس کام کو از خود کرنا چاہے تو اس کے پاس بڑے وسیع ذرائع ہونے چاہئیں۔ ادارہ طلوع اسلام کے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں؟

باقی رہا اس عہد کی تاریخ سے کچھ مثالیں پیش کرنے کا سوال، سو اس کے لئے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد جو پہلا واقعہ تاریخ میں مذکور ہے (بلکہ یوں کہئے کہ جس کا آغاز حضورؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات ہی سے ہو گیا تھا)۔ وہی اس حقیقت کی بیّن مثال ہے۔ اس واقعہ کو سامنے لانے سے پہلے، تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ

(۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔

(۲) معراج کا معیار انسان کا ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے۔

(۳) خون اور رنگ۔ (قبیلہ۔ نسب۔ قوم) کے امتیازات یا نسلی تفاخر کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

(۴) ملت کے معاملات، باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔

(۵) ملوکیت — یعنی حکومت کا ورثہ میں ملنا — غیر قرآنی تصور ہے۔ خلیفہ کا انتخاب باہمی مشورہ سے ہونا چاہیئے۔

قرآن کی یہ وہ تعلیم ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ تعلیم تھی جسے نبی اکرمؐ زندگی بھر عام کرتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے رہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جسے صحابہ کبارؓ نے حاصل کیا اور اس پر عمل پیرا رہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا کوئی شخص اس کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ یہی صحابہؓ رسول اللہؐ کی وفات کے چند ثانیہ بعد (بلکہ حضورؐ کی وفات سے بھی پہلے) خدانکردہ ایسی روش اختیار کر لیں گے جو قرآن کی اس بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے پورے پروگرام کے خلاف ہو۔ کوئی مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن دیکھئے کہ ہماری تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

حضرت علیؓ اور مسئلہ خلافت

بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت ہے:۔

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی، علی ابن ابی طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حال میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمدللہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے تو عباس بن عبد المطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو، رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کریں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسرے لوگوں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمادیں گے (اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا۔) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے — خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۴۲۳)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ (تاریخ کی رو سے) ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ آپؐ کی جانشینی کا سوال بنو ہاشم میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے دل میں پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی لیکن

قوسین والی عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مرزا سہیل نعیمی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے تصریح کرا لینا ضروری سمجھتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ کی طرف جو جواب منسوب کیا گیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی "بخدا اگر اس بارے میں ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ ہمیں کبھی بھی حکومت نہیں دیں گے۔

اب آگے بڑھیئے۔ رسول اللہؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے اپنے جانشین کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ امت کو

بیعت حضرت ابوبکر صدیقؓ

پہلی مرتبہ امیر ملت کے انتخاب سے واسطہ پڑا۔ رسول اللہ کی ہنوز تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا ایک اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ وہیں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک قریش (مہاجرین) میں سے۔ اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں تشریف لے گئے۔ اس اجتماع کی جو روداد تاریخ نے بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت حباب بن منذرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ لوگ تمہارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہل عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

(محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبرؓ" صفحہ)

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ کی طرف حسب ذیل تقریر منسوب کی گئی ہے۔

"ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب رسول تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملے میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔"

دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے یہ حدیث پیش کی گئی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہؐ کے اہل خاندان ہیں اس لئے خلافت کے ہم حقدار ہیں۔ اور پھر

یہ حدیث کہ خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ کس طرح قرآن کی اس بنیادی تعلیم کے خلاف جاتی ہے جس کی عملی تبلیغ نبی اکرمؐ ساری عمر فرماتے رہے۔

اور آگے بڑھئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لئے ہجوم کر کے آگے بڑھنے لگے تو انصار میں سے ایک صاحب نے کہا کہ

دیکھو سعدؓ تمہارے پاؤں کے نیچے نہ روندے جائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

وہ ہے ہی روندے جانے کے قابل۔ اللہ اسے ذلت نصیب کرے۔　　　(صفحہ ۱۲۴)

تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی۔

وہ نہ ان کے ساتھ نماز پڑھتے اور نہ اُن کے ساتھ شامل ہو کر حج کے ارکان بجا لاتے۔　　　(صفحہ ۱۲۵)

یہ ہے، ہماری تاریخ کی رُو سے، باہمی تعلقات کا نقشہ ان صحابہؓ کا جن کے متعلق قرآن یہ سارٹیفکیٹ دیتا ہے کہ "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ" وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بہت ہمدرد تھے۔

حضرت علیؓ کا موقف

یہ تو رہی اس اجتماع کی روئداد۔ اب یہ دیکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق حضرت علیؓ اور دیگر ارباب بنو ہاشم کا ردِ عمل (تاریخ کی رُو سے) کیا تھا۔ ہیکل اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے ایک جماعت نے ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کی اور ان کا میلان علی بن ابی طالبؓ کی طرف تھا۔ ان میں عباسؓ بن عبد المطلب، فضل ابن عباس، زبیر ابن العوام، ابن العاص، خالد بن سعید، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، براء بن عازب اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

ابوبکرؓ نے عمر بن الخطابؓ، ابو عبیدہ ابن الجراح، اور مغیرہؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارہ میں مشورہ کیا۔ انھوں نے حضرت صدیقؓ کو عباس ابن عبد المطلب سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنی طویل گفتگو میں حضرت عباسؓ سے کہا۔ ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ اس امر خلافت میں آپ کا حصہ بھی ہونا چاہیئے جو آپ کو اور آپ کی اولاد کو برابر ملتا رہے۔ کیونکہ آپ بہر حال رسول اللہ کے چچا ہیں۔ یعقوبی نے حضرت عباسؓ کی گفتگو بیان کرتے ہوئے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے۔

"اگر حکومت ہمارا حق ہے تو ہم اس پر راضی نہیں کہ کچھ لیں اور کچھ چھوڑ دیں۔"

ایک روایت میں یہ بھی موجود ہے جسے یعقوبی اور دوسرے بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے اور یہ روایت آج تک برابر مشہور چلی آرہی ہے کہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت حضرت فاطمہؓ کے مکان میں حضرت علیؓ کے پاس جمع ہوئی جو حضرت علیؓ سے بیعت کرنا چاہتی تھی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے جنھوں نے فرمایا۔ خدا کی قسم! لوگوں میں کوئی بھی محمدؐ کی جانشینی کا تم سے زیادہ حقدار

نہیں ہے۔"

ابوبکرؓ وعمرؓ کو حضرت فاطمہؓ کے مکان میں ان لوگوں کے اجتماع کی خبر ہوئی تو وہ ایک جماعت کے ساتھ وہاں پہنچے...... حضرت عمرؓ نے ان کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور ان کی تلوار توڑ ڈالی اور یہ لوگ مکان کے اندر گھس گئے۔ حضرت فاطمہؓ نکلیں اور انھوں نے پکار کر کہا "خدا کی قسم! تم لوگ یا تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ میں اپنے بال پراگندہ کر کے خدا کے سامنے گریہ وزاری اور بددعا کروں گی"۔ حضرت فاطمہؓ کی اس دھمکی پر گھر میں جس قدر لوگ تھے سب ایک دم باہر نکل گئے۔ یہ لوگ کچھ دن تک تو یونہی رہے پھر یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرتے چلے گئے۔ مگر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے انتقال تک ــ یعنی چھ ماہ تک ــ بیعت نہیں کی اور ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہیں چالیس روز کے بعد انھوں نے بیعت کر لی تھی۔

حضرت علیؓ اور بنوہاشم کے تخلف کے بارہ میں جو روایت سب سے زیادہ مشہور اور شائع و ذائع ہے یہ وہ روایت ہے جسے ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں بیان کیا ہے۔ اسے اور اسی قسم کی دوسری روایتوں کو ان کے معاصرین اور متاخرین نے بھی بیان کیا ہے وہ روایت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک جماعت کے ساتھ ابوبکرؓ کی بیعت کی تکمیل کے بعد بنوہاشم کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ باہر نکل کر جیسا کہ تمام لوگوں نے بیعت کر لی ہے وہ بھی بیعت کریں۔ بنوہاشم اس وقت حضرت علیؓ کے مکان میں مجتمع تھے۔ بنوہاشم اور ان کے تمام ہمنواؤں نے عمرؓ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ زبیر بن العوامؓ ہاتھ میں تلوار لئے عمرؓ اور ان کے ساتھیوں کی طرف نکلے۔ عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو پکڑ لو۔ چنانچہ لوگوں نے ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور انھوں نے جا کر بیعت کر لی۔ علی ابن ابی طالبؓ سے کہا گیا کہ ابوبکرؓ سے بیعت کر لو۔ علیؓ نے جواب دیا میں تم سے بیعت نہیں کر سکتا۔ تمھاری بہ نسبت میں امر خلافت کا زیادہ حقدار ہوں اور تم لوگوں کو مجھ سے بیعت کرنا چاہیئے۔ تم لوگوں نے یہ امر خلافت انصار سے لیا ہے اور نبی صلعم کے ساتھ اپنی قرابت سے استدلال کیا ہے۔ تم لوگ اہل بیت سے خلافت کو غصبًا چھیننا چاہتے ہو۔ کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا کہ تم ان کی بہ نسبت خلافت کے اس لئے زیادہ حقدار ہو کہ محمدؐ تم میں سے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے تمھیں قیادت و امامت سونپ دی؟ لہٰذا اب میں بھی تمھارے خلاف اسی دلیل سے استدلال کرتا ہوں جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں استدلال کیا تھا۔ ہم زندگی اور موت ہر دو حال میں رسول اللہؐ سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر تم میں ایمان ہے تو انصاف سے کام لو۔ ورنہ اس ظلم کے نتیجہ کے لئے تیار ہو اور وہ نتیجہ تم جانتے ہو۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ جب تک تم بیعت نہ کرو گے تمھیں یوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

حضرت علیؓ نے گرمی اور شدت کے ساتھ جواب دیا۔" اونٹنی کا دودھ دوہ لو آدھا تمھیں مل جائے گا اور آج اس کا تھن باندھ کر چھوڑ دو تاکہ باقی کل کو مل جائے۔

ابوبکرؓ کو ڈر ہوا کہ ان کی تیز کلامی کہیں شدت اختیار نہ کرلے لہٰذا وہ دونوں کے بیچ میں آگئے اور حضرت علیؓ سے انھوں نے فرمایا اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمھیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس کے بعد ابو عبیدہؓ بن الجراح حضرت علیؓ کے پاس گئے اور نرمی سے ان کو سمجھایا اور کہا۔ "بھتیجا! تم نوعمر ہو۔ یہ لوگ تمھاری قوم کے بوڑھے ہیں، نہ تمھیں ان جیسا تجربہ ہے نہ معاملات کی پہچان ہے۔ میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ امر خلافت کے لئے ابوبکرؓ تم سے زیادہ قوی، اہل اور موزوں شخص ہیں۔ لہٰذا اس امر کو تم ان ہی کے حوالہ کردو۔ اگر تم زندہ رہے اور تمھاری عمر نے وفا کی تو اس میں شبہ نہیں کہ تم فضل، دین، علم، فہم، سبقتِ اسلام، نسب اور قرابت کے اعتبار سے ہر طرح اس کے اہل ہو۔"

اس پر حضرت علیؓ برافروختہ ہو کر بولے۔ "مہاجرین کی جماعت! اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ عرب پر محمدؐ کی سلطنت کو اس کے گھر اور اس کے مخزن سے نکال کر اپنے گھروں اور اپنے حفاظت خانوں میں نہ لے جاؤ اور سلطنت والوں کو ان کے مقام اور حق سے نہ ہٹاؤ۔ خدا کی قسم اے مہاجرین! ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور جب تک ہم میں کتاب اللہ کے پڑھنے والے، اللہ کے دین کی سمجھ رکھنے والے، رسول اللہؐ کی سنتوں کو جاننے والے، امر رعیت کا لحاظ رکھنے والے، ان سے برائیوں کو دور کرنے والے، ان کے درمیان مساوات کے ساتھ اموال کو تقسیم کرنے والے موجود ہیں۔ ہم ہی امر خلافت کے مستحق ہیں۔ خدا کی قسم خلافت ہم ہی میں ہے۔ تم لوگ خواہشات کی پیروی کرکے اللہ کی راہ سے گمراہ نہ ہو جاؤ کہ اس طرح تم حق سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔

روایت کا بیان ہے کہ بشیر بن سعد اس گفتگو کے وقت موجود تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سنیں تو انھوں نے کہا۔ اے علیؓ! اگر انصار نے یہ باتیں ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلینے سے پہلے سن لی ہوتیں تو وہ کبھی تمھارے بارہ میں اختلاف نہ کرتے۔

حضرت علیؓ یہاں سے غصہ میں بھرے ہوئے نکلے اور رات کے وقت حضرت فاطمہؓ کو ایک سواری پر سوار کرکے ساتھ لیا اور انصار کی مجالس میں گھومنا شروع کردیا۔ حضرت فاطمہؓ نے انصار سے مدد مانگی تو وہ جواب میں کہتے تھے۔ اے رسول اللہؐ کی صاحبزادی! ہم اس شخص (ابوبکرؓ) کے ہاتھ پر بیعت کرچکے ہیں۔ اگر تمھارا شوہر اور چچیرا بھائی ابوبکرؓ سے پہلے آجاتا تو ہم اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔

حضرت علیؓ کا غصہ اس جواب پر اور بھی تیز ہوگیا اور انھوں نے جواب دیا "کیا میں رسول اللہؐ کو بلا دفن گھر میں چھوڑ کر چلا آتا اور سلطنت کے لئے لوگوں سے جھگڑتا پھرتا؟"

اس پر حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کچھ کیا جو ان کو زیبا تھا۔ اور لوگوں نے وہ کچھ کیا جس کا وہ خدا کو جواب اور حساب دیں گے۔

اس واقعہ کے متعلق بخاری میں حسب ذیل روایت ملتی ہے۔

حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا۔ اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں۔ تو اب انھوں نے ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو آپ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔[2]

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیقؓ منبر پر چڑھے۔ خطبہ دیا اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انھوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور اس کے بعد حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کا بیان کیا اور کہا کہ انھوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انھیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے لہذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے

(صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۹)

---

[1] بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ اور کیا ہے۔ معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں۔ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی حتیٰ کہ چھ ماہ بعد جب حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔

(ابن جریر طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰۸)

[2] ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ابن جریر ج ۲ صفحہ ۲۰۸)

[3] ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولكنا كنا نرى لنا في هذا الأمر حقا فاستبددتم به علينا۔ یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ابن جریر طبری ج ۲ صفحہ ۲۰۸)

قطع نظر اس کے کہ یہ تاریخی روایات صحابہ کبارؓ کے باہمی تعلقات کے متعلق کس قسم کی تصویر پیش کرتی ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی رُو سے، ایک طرف مہاجرین، انصار کے مقابلہ میں، "حقِ خلافت" کے لئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ "الائمۃ من قریش" تو دوسری طرف، خود قریش ہی سے حضرت علیؓ اپنے حقِ خلافت کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے قرابت کی بنا پر انہیں خلافت بطور استحقاق ملنی چاہیئے؛ اور جن لوگوں نے انہیں ان کے اس حق سے محروم کیا ہے وہ مستبد اور غاصب ہیں۔ یہی وہ "غصب و استبداد" ہے جس کی بنا پر تاریخ (یعنی شیعہ حضرات کی روایت) یہاں تک کہتی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، بجز معدودے چند حضرات (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) تمام صحابہ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق ممکن ہے سُنّی حضرات کہہ دیں کہ یہ روایت تعصب پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود بخاریؔ میں بھی حسبِ ذیل روایت موجود ہے۔

> حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا۔ برہنہ بدن۔ بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے۔ آپ نے یہ آیت پڑھی کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۔ وَعْدًا عَلَيْنَا ۔ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔
>
> اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہونگا یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1] جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم
>
> (بخاری کتاب الانبیاء۔ ترجمہ شائع کردہ۔ نور محمد تاجر کتب۔ کراچی۔ جلد دوم صفحہ ۱۴۹)

یہ ہیں چند مثالیں ہمارے تاریخی ذخیرہ میں سے؛ صرف ایک واقعہ کے متعلق جو رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد پیش آیا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کے بعد کے واقعات کے متعلق اس تاریخ میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔؟

اور یہ ہے وہ تاریخ جسے قرآن کے مقابلہ میں، دینی معاملات میں بہ حیثیت سند پیش کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، طلوعِ اسلام کا اس باب میں یہ مسلک ہے کہ ہم نبی اکرمؐ کے متعلق یہ ایمان اور حضورؐ کے صحابہ کبارؓ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی قرآن کریم کے مطابق بسر کی ہوگی۔ لہٰذا اگر ہماری تاریخ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب کی گئی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہم بلا تامل کہدیں گے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ انہوں نے کبھی ایسا کیا یا کہا نہیں ہوگا۔ اور ہمارا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر ہمیں "منکرِ حدیث" اور نہ معلوم کیا کچھ نہیں کہا جا رہا! غور فرمائیے کہ ہم بخاری کی اس حدیث کو کس طرح صحیح تسلیم کرلیں کہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ کبار کی ایک جماعت (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دین سے مرتد ہو گئی تھی؟ ہم کہاں سے وہ جگر لائیں جو یہ کچھ سن کر شق نہ ہو جائے؟

---

[1] بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علی اعقابھم" ہیں۔

یہ وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ جب قرآن اور تاریخ میں تصادم واقع ہو تو ہمیں تاریخ کے مقابلہ میں قرآن کو سند ماننا چاہیئے اور کسی مذہبی عقیدہ یا عمل کے لئے تاریخ کو بطور حجت پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ جب تک ہم قرن اول کی تاریخ کا قرآن کی روشنی میں تنقید کر کے اسے از سر نو مرتب نہیں کرتے، نہ دین کی صحیح عملی شکل ہمارے سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی ان حضرات کی صحیح سیرت۔ لیکن جمود اور تقلید کا برا ہو کہ جو شخص اس قسم کی آواز بلند کرتا ہے اُسے ملحد اور بے دین قرار دیا جاتا ہے۔

* * *

احادیث صحیحہ کا مجموعہ

مری سے ہمیں ایک صاحب کا خط موصول ہوا ہے جو کم و بیش اسی موضوع سے متعلق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"جس طرح حضرت امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث میں سے تقریباً چھ ہزار احادیث کو صحیح مان کر مجموعہ بخاری شریف مرتب کر ڈالا تھا اسی طرح سے آپ بھی قرآن پاک اور شانِ رسالت سے مطابقت رکھنے والی احادیث کا ایک گرانقدر مجموعہ مرتب فرما کر شائع کریں۔ ایسے مجموعہ کی موجودگی میں آئندہ کسی مولوی یا کسی جماعت کو آپ کے بارے میں منکرِ حدیث۔ منکرِ سنت اور منکرِ شانِ رسالت ثابت کرنے کا پراپیگنڈا کرنے کی جرأت نہ رہے گی۔ یہ الزام جس کا سہارا لے کر یہ لوگ طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھولے ہوئے ہیں خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آپ کا یہ کارنامہ عامۃ المسلمین کو قرآنی تعلیمات کے زیادہ نزدیک لانے کا باعث بننے کے علاوہ سیدھے سادے مسلمانوں کے دلوں میں طلوع اسلام کے خلاف بھرے ہوئے زہر کے لئے بھی ایک تریاق ثابت ہوگا۔"

طلوع اسلام - سب سے پہلے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ طلوع اسلام کے سامنے ایک مقصد اور ایک نصب العین ہے۔ یعنی دینِ خالص کی نشر و اشاعت اور اُس معاشرہ کی تشکیل جسے نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا تھا ____ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسی مقصد کے حصول کے لئے کرتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ مخالفین کو ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہمارا مسلک موافقین اور مخالفین سب کے سامنے کھلا ہے۔ مخالفین ہمارے خلاف اس لئے پراپیگنڈہ نہیں کرتے کہ ہمارا مسلک غلط ہے وہ اس لئے پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ قرآنی معاشرہ کی تشکیل سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی ہے۔

جہاں تک ہمارے مکتوب نگار کی تجویز کا تعلق ہے۔ اس کا بنیادی جواب وہی ہے جو تاریخ کی تدوینِ نو کے سلسلہ میں ہم سابقہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کام بین الملی حیثیت سے کرنے کا ہے نہ کہ انفرادی حیثیت سے۔

جہاں تک احادیث کا مجموعہ مرتب کرنے کا تعلق ہے، یہ معاملہ عام تاریخ کی ترتیب جدید سے بھی زیادہ نازک ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ مروج احادیث میں سے، اپنی صوابدید کے مطابق ایک مجموعہ مرتب کیا۔ لیکن بعد میں ہوا یہ کہ اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کا ایک ایک لفظ قول یا عمل رسولؐ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات خود امام موصوفؒ کے ذہن میں بھی نہیں ہوگی کہ اُن کی اس انفرادی کوشش کو بعد میں یہ حیثیت دیدی جائے گی؛ نتیجہ اس کا یہ کہ اگر آج کوئی شخص اس مجموعہ کی کسی حدیث کے متعلق یہ کہہ دے کہ یہ قرآن کے

خلاف ہے لہذا غلط، تو اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ خود قولِ رسولؐ کا منکر ہے۔ یعنی امام بخاریؒ کے انتخابی فیصلے پر تنقید (معاذ اللہ) خود ذاتِ رسالتمآب پر تنقید قرار دیدی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مجموعہ قرآن کی مثل اور اس کا ہم پایہ (نقلِ کفر کفر نباشد، معاذ اللہ) تصور کر لیا گیا ہے۔ یہی وہ خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ رسول اللہؐ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کیا جائے۔ مختصر جامع بیان العلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ سنتِ رسول اللہؐ کو لکھوا لیا جائے۔ آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد آپ ایک ماہ تک اس معاملہ کو سوچتے رہے اور بالآخر فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ دلیل یہ تھی کہ

> پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور انہی پر
> جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ہوسکتا ہے کہ ہم آج ایک جدید مجموعہ احادیث مرتب کریں جسے ہم اپنی صوابدید کے مطابق صحیح سمجھیں اور کل لوگ اس مجموعہ کو خود اقوالِ رسول اللہؐ سمجھنے لگ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو کسی قسم کی "شرعی حیثیت" حاصل ہو جاتی ہو اسے انفرادی کوششوں پر چھوڑنا ہی نہیں چاہئے۔ زید، بکر، یا عمر کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنے کسی فیصلہ کو اُمت کے لئے شریعت بنا دے۔ یہ کام اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے کرنے کا ہے۔ اُسی کا کام ہے کہ وہ

(۱) ایک مستند تاریخ مرتب کرے اور اُسے اُمت کے لئے بطور نصاب مقرر کر دے۔ اور باقی کتبِ تاریخ کے متعلق فیصلہ کردے کہ وہ غیر مستند ہیں۔ اور

(ii) فقہ اور روایات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کرے۔ امت کے لئے یہ قوانین شرعی حیثیت رکھیں گے۔ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کے زمانے میں یہی ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے مجموعہ احادیث مرتب کرنے کی مخالفت کی تھی تاکہ وہ مجموعہ کہیں دین کی حیثیت اختیار نہ کر جائے اور اس طرح اُمت اُسی پر جھک پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دے۔

پاکستان میں پیری مریدی

جہلم سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان میں پیری مریدی کا بہت زور ہو گیا ہے۔ جہلا میں ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ میں بھی۔ اس کی وجہ کیا ہے اور علاج کیا؟

طلوعِ اسلام - پیری مریدی کی نفسیات پر غور کیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پاکستان میں اس کا زور کیوں ہو گیا ہے۔ جو قوم قانون کی پابند ہو اُسے غیر قانونی سہارے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ "قانون" میں قوانینِ فطرت، وحی کے متعین کردہ قوانینِ انسانیت اور مملکت کے معاشرتی قوانین سب آجاتے ہیں۔ مثلاً

(۱) جو شخص جسم سے متعلق طبعی قوانین پر یقین رکھتا ہے وہ اگر بیمار ہوتا ہے تو حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ "روحانی عاملو

کی طرف وہی جاتا ہے جسے ان قوانین کا علم یا ان پر یقین نہ ہو۔

(۲) دین کا مدار، قانون مکافات عمل پر ہے۔ یعنی ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے اور کوئی قوت اس نتیجے کو بدل نہیں سکتی۔ جو شخص دین کی اس بنیادی حقیقت پر یقین رکھتا ہے وہ کبھی ان آسروں کی تلاش نہیں کرتا جو "قانون مکافات" کے خلاف نتائج برآمد کرو دینے کے مدعی ہوں۔ وہ عمل کرتا ہے اور اس کے نتیجے کا منتظر رہتا ہے۔

(۳) جس معاشرہ کا نظم و نسق قانون کے مطابق طے پاتا ہو اس میں جو شخص قانون کا اتباع کرتا ہے اُسے کسی قسم کا خطرہ نہیں رہتا۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے۔ غیر قانونی سہاروں کی کسی کو ضرورت نہیں پڑتی۔ خواہ وہ رشوت یا سفارش کی شکل میں ہوں اور خواہ پیروں فقیروں کی دعا یا نذر نیاز کی صورت میں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں گذشتہ دس سال تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے رہنے والے غیر قانونی سہاروں کے عادی ہو گئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کوئی کاروبار شروع کیا تو اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اسے قاعدے اور قانون کے مطابق کیا کرنا اور کتنا کمانا چاہیئے۔ اس نے معلوم کرنا یہ شروع کیا کہ کون کون سے غیر قانونی ذرائع اختیار کئے جائیں۔ کسے رشوت دی جائے اور کس تک سفارش پہنچائی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوٹ مچائی جا سکے۔ اس کے لئے اگر ہزار روپیہ رشوت کے دیئے تو دس روپے پیر صاحب کی بھی نذر کر دیئے تاکہ وہ بھی اس کی اس مہم میں اس کی مدد کریں۔ پھر اگر پکڑے گئے تو جہاں دو ہزار روپیہ پولیس یا عدالت تک پہنچایا، سو روپیہ "روحانی آسروں" پر بھی خرچ کر دیا تاکہ ان کی مدد سے اس بلا سے نجات مل جائے۔

یا اگر کوئی شخص (خلاف قاعدہ) ملازمت میں ترقی کرنا چاہتا تو ایک طرف وہ افسر بالا تک سفارشیں اور رشوت پہنچاتا اور دوسری طرف نذر نیاز مانتا تاکہ ان ذرائع سے کامیابی ہو جائے۔

مختصراً یہ کہ جب انسان خلاف قانون روش زندگی اختیار کر لے تو اپنے آپ پر اعتماد (Self - Confidence) باقی نہیں رہتا۔ اور جب خود اعتمادی نہ رہے تو پھر "روحانی سہاروں" کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

قانون کا پابند اپنی قوتِ بازو اور قانون کی محکمیت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اُسے اس قسم کے نفسیاتی (psychological) سہاروں۔ دریا بالفاظِ دیگر فریب نفس) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن نے جہاں میسرہ سے منع فرمایا ہے تو اس کی علم بھی یہی ہے۔ میسرہ کے عام معنی "جوا" کئے جاتے ہیں لیکن درحقیقت اس سے مراد ایسی دولت ہے جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ یُسریٰ بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی، آسان کام کے لئے کہتے ہیں کہ "یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" جو دولت، قاعدے اور قانون کے خلاف، محنت اور مشقت کے بغیر، نہایت آسانی سے ہاتھ آجائے وہ میسرہ میں شامل ہے۔ گذشتہ دس سال ہمارے

قوم کا بیشتر طبقہ اسی طرح دولت حاصل کرنے میں مصروف رہا اور اس کا اس طرح عادی ہو گیا کہ قاعدے اور قانون کے مطابق، محنت و مشقت سے روٹی کمانا اس کے لئے مصیبت بن گیا۔ اس قسم کی رہبری کی کمائی کے لئے انسان نفسیاتی سہاروں کا محتاج ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کے بعد، دل میں ایک خلش بھی پیدا ہوتی ہے راستے سوسائٹی کا ڈر کہیے یا بچپن سے دل میں پڑے ہوئے خیالات کی بنا پر۔ بہرحال ایک خلش ضرور پیدا ہوتی ہے اگرچہ رفتہ رفتہ اس کا احساس بھی مٹ جاتا ہے، اس خلش کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے بھی انسان کو فریب نفس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ مقصد پیروں فقیروں کی دعاؤں اور منتوں اور نیازوں سے حاصل ہو جاتا ہے۔ پیر ہر مصیبت کے وقت کام آنے اور آخرت میں نجات دلانے کا ضامن ہوتا ہے۔ جو اس کا دامن تھام لے وہ ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی نظروں میں نیکوکار اور بدکار میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بلکہ جو زیادہ گنہگار (یعنی مجرم) اور بدکردار ہو وہ اس کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بدکرداروں کے طبقے عام طور پر پیر پرست ہوتے ہیں) اس کا تصور ان لوگوں کو نفسیاتی کشمکش سے نجات دلا کر "اطمینان قلب" کا موجب بن جاتا ہے۔

یہ ہیں، مختصراً وہ وجوہات جن کی بنا پر پاکستان میں پیر پرستی کا زیادہ زور ہو گیا ہے۔ اب رہا اس کا علاج؟ سو مرض کی تشخیص کے بعد، علاج بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یعنی

(۱) جہاں تک قوانین طبعی سے ناواقفیت (جہالت) کی بنا پر پیر پرستی اور قبر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج سائنس کی تعلیم کا عام کرنا ہے۔ اس سے توہم پرستیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۲) جہاں تک مذہب کے معاملہ میں پیر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج قرآن کریم کی تعلیم کا عام کرنا ہے۔ اس سے خدا کا حکم اور اس کا قانون مکافات اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے کہ انسان نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہی نہیں ہوتا۔ قرآن اپنے آپ کو شفاء لما فی الصدور کہتا ہے۔

(۳) جہاں تک دنیاوی معاملات کے لئے "روحانی سہاروں" کا تعلق ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرہ میں قانون کا سکہ اس طرح سے رواں ہو کہ اس کی اطاعت کرنے والے کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہ رہے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے اسے کوئی قوت پاداش عمل سے بچا نہ سکے۔ نیز معاشرہ میں خدا کا معین کردہ نظام ربوبیت اس انداز سے قائم کر دیا جائے کہ مملکت کا کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہ ہونے پائے۔ نظام خداوندی کی یہ وہ زندہ کرامات ہیں جنہیں آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد انسان کو کسی وہمی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ تھی مرض کی تشخیص اور یہ ہے اس کا علاج۔

قرآنی فیصلے

روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

قیمت:۔ چار روپے

اسلام کی سرگزشت

فصل دوم

(حدیث)

سنت یا حدیث سے رسول اللہ صلعم کے اقوال، افعال، یا لوگوں کے اعمال پر آپ کی خاموشی مراد ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلعم کے عہد کے بعد حدیث میں وہ باتیں بھی شامل ہوگئیں جو صحابہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔ صحابہؓ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہتے، آپ کی باتیں سنتے، آپ کے اعمال کا مشاہدہ کرتے اور جو کچھ انھوں نے دیکھا یا سنا تھا اسے بیان کرتے تھے۔ اس عہد کے بعد تابعین آئے وہ صحابہؓ کے ساتھ رہے، ان سے انھوں نے باتیں سنیں اور جو کچھ وہ کرتے تھے اسے انھوں نے دیکھا۔ لہٰذا رسول اللہ صلعم اور صحابہ کی خبریں "حدیث" کہلائیں۔

دین میں حدیث کی بڑی قیمت ہے اور اس کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتیں مجمل، مطلق یا عام ہیں۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد یا آپ کا عمل اس کی توضیح کرتا۔ مطلق کو مقید کرتا یا عام کو مخصوص کر دیتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے نماز کی تفاصیل بیان نہیں کیں۔ نماز کا مجملاً حکم دیا ہے۔ نبی صلعم کے فعل نے اس کے اوقات اور کیفیات کو واضح کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے خمر (شراب) کو حرام قرار دیا ہے۔ "إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ" (اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شراب جوا، بتوں کے استھانوں پر چڑھاوے۔ اور پانسے کے ذریعے فیصلے سب گندے اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے بچو۔) لیکن خمر سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی کتنی مقدار حرام ہے؟ وغیرہ یہ تمام باتیں حدیث نے بیان کی ہیں۔

رسول اللہ صلعم کو حوادث و وقائع پیش آتے رہتے تھے جن میں آپ فیصلہ دیتے تھے۔ لوگ آپ سے سوال کرتے تھے جن کا آپ جواب دیتے تھے۔ آپس میں لین دین اور تبادلے ہوتے تھے، امن اور جنگ کے حالات میں مختلف تصرفات ہوتے

تھے۔ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں کہ کبھی تو ان کے بارہ میں قرآن میں کوئی حکم نازل ہو جاتا تھا اور کبھی نازل نہیں ہوتا تھا۔ یہ دوسری قسم پہلی قسم کی طرح اہل تشریع کے اجتہاد کی آماجگاہ تھی۔ ان تمام باتوں نے حدیث کے اہتمام پر لوگوں کو مجبور کیا۔

رسول اللہؐ کے عہد میں تدوین حدیث نہیں ہوئی

قرآن کریم رسول اللہ صلعم کے عہد میں مدون ہو چکا تھا لیکن حدیث کی تدوین نہیں کی گئی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے کاتبین وحی کی ایک جماعت مقرر فرما رکھی تھی جو قرآن کی آیات کو ان کے نازل ہوتے ہی لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلعم نے ایسے کوئی کاتب مقرر نہیں کئے تھے کہ قرآن کے علاوہ آپ جو کچھ بولتے تھے وہ اسے قلم بند کر لیا کریں۔ اس کے برعکس ہمیں بہت سی ایسی حدیثیں مل جاتی ہیں جن میں تدوین حدیث سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ "میری باتیں لکھا نہ کرو۔ جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کوئی بات لکھ لی ہو وہ اسے مٹا دے۔ البتہ تم میری باتوں کو بیان کر سکتے ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے۔" ایسے ہی امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ "جب نبی اکرمؐ کی بیماری میں شدت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے کاغذ قلم دوات لادو۔ میں تمہارے لئے ایک ہدایت نامہ تحریر کرا دوں تاکہ تم میرے بعد راہ سے بھٹک نہ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم پر اس وقت تکلیف کا غلبہ ہے۔ ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہے جو ہمیں کافی ہے۔"

چند حدیثیں ضرور لکھی گئیں

کچھ ایسی حدیثیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد میں حدیث کے کچھ صحیفے لکھے گئے تھے۔ مثلاً بخاری نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ فتح مکہ کے سال خزاعہ نے بنو لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا کیونکہ بنو لیث نے اس سے پہلے بنو خزاعہ کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا۔ حضور کو اس کی اطلاع ہوئی تو اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا "خدا نے مکہ سے قتل و غارت کو روک دیا ہے۔ اہل مکہ پر اللہ کے رسول اور مومنین کا تسلط قائم کر دیا گیا ہے۔ مکہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال ہوا ہے اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہوگا۔ یاد رہے کہ میرے لئے بھی دن کے چند گھنٹوں کے واسطے حلال کیا گیا تھا۔ اور یہ اس وقت حرام ہے۔ اس کے کانٹے نہیں کاٹے جا سکتے اس کے درخت نہیں کاٹے جا سکتے۔ اس کی گری پڑی چیز لقطہ کے طور پر اٹھائی نہیں جا سکتی۔ البتہ وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو اس کا اعلان کرکے اس کے مالک تک اسے پہنچا دے۔ جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو باتوں کا اختیار ہے یا تو مقتول کے ورثہ کو دیت دیدی جائے یا مقتول کے ورثہ کو قصاص ادا کر دیا جائے۔ اس پر یمن کے ایک آدمی نے عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلعم میرے لئے ان ہدایات کو لکھوا دیجئے (یعنی یہ پورا خطبہ قلم بند کرا دیجئے) اس پر آپ نے حاضرین کو حکم دیا کہ ابو فلاں (یمنی) کے لئے اس خطبہ کو لکھ دو۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عمروؓ ابن العاص کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ رسول اللہؐ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔

بعض علماء نے ان متعارض روایات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ ممانعت نزول قرآن کے زمانہ میں تھی۔

تاکہ قرآن اور حدیث میں باہم التباس نہ ہو جائے۔

تدوینِ حدیث کیلئے کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا

یہ واقعہ ہے کہ اس عہد میں حدیث کی تدوین عام نہیں تھی اور نہ اس کی تدوین کے لئے کوئی خاص نظام مقرر تھا جیسا کہ قرآن کے لئے تھا۔

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ایک ہی مدوّن کتاب تھی اور وہ قرآن تھا۔ احادیث غیر مدوّن صورت میں رسول اللہ سے زبانی بیان کی جاتی تھیں اور زیادہ تر حافظہ سے بیان کی جاتی تھیں۔ کسی صحیفہ سے نہیں۔

جب کوئی نیا معاملہ پیش آتا جس کے لئے قرآن میں کوئی حکم موجود نہ ہوتا اور کسی صحابیؓ کو معلوم ہوتا کہ اس جیسا کوئی معاملہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھی پیش آیا تھا اور آپ نے اس کا یہ فیصلہ کیا تھا تو وہ آپ کے اس فیصلہ کو بیان کر دیتا تھا۔ اسی طرح وہ آپ کے زمانہ کے غزوات اور وعدہ وعید وغیرہ سے متعلق آپ کے ارشادات کو بھی بیان کر دیتے تھے۔ بعض صحابہ رسول اللہ صلعم سے

صحابہ بکثرت روایات کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے

بکثرت روایت بیان کرنے کو بُرا جانتے تھے۔ کچھ تو اس اندیشہ سے کہ انہیں کوئی غلط بات منہ سے نہ نکل جائے اور کچھ اس اندیشہ سے بھی کہ کہیں روایات کی کثرت لوگوں کو قرآن سے نہ روک دے۔ قرطبی نے اپنی کتاب —— جامع بیان العلم —— میں قرظہ بن کعب سے نقل کیا ہے کہ ہم عراق جانے کے لئے نکلے۔ حضرت عمرؓ ہماری مشایعت کے لئے "حرار" کے مقام تک آئے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے وضو کیا اور دو دو مرتبہ تمام اعضاء دھوئے پھر فرمایا۔ جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیوں چل کر آیا ہوں؟ لوگوں نے کہا ہاں! ہم رسول اللہ کے اصحاب ہیں۔ آپ ہمارے اکرام کے لئے ہمارے ساتھ چل کر آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم ایسے شہر کے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو بکثرت قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے قرآن کی تلاوت کی بھنبھناہٹ ایسی ہوتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ حدیثوں میں لگا کر انہیں قرآن سے نہ روک دینا۔ قرآن کی تلاوت اچھی طرح کرنا اور رسول اللہ صلعم سے بہت کم روایتیں بیان کرنا۔ اچھا اب جاؤ! میں تمہارا شریک ہوں۔ جب قرظہؓ عراق میں آئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ہم سے حدیثیں بیان کیجئے۔ قرظہؓ نے جواب دیا کہ ہمیں حضرت عمر بن الخطابؓ نے اس سے منع کر دیا ہے۔

روایت قبول کرنے میں تشدّد

بعض صحابہؓ کا تو یہ حال تھا کہ جب ان کے سامنے رسول اللہ صلعم کی کوئی حدیث بیان کی جاتی تھی تو وہ روایت کی صحت پر دلیل کا مطالبہ کرتے تھے۔ مثلاً حاکم نے بیان کیا ہے کہ ایک دادی حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا پوتا مر گیا ہے جس کے مال میں میرا حق ہے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مجھے تو کتاب اللہ میں تیرا کوئی حصہ نظر نہیں آتا اور نہ ہی میں نے رسول اللہ صلعم سے اس کے بارہ میں کچھ سنا ہے۔ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا تو مغیرہ ابن شعبہؓ نے شہادت دی کہ رسول اللہ صلعم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کس نے اس بات کو سنا ہے تو محمد بن مسلمہؓ نے بھی اس بات کی شہادت دی۔ اس پر

حضرت ابوبکرؓ نے اس کو چھٹا حصّہ دلوا دیا۔ بخاری اور مسلم نے ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ میں انصار کی کسی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابو موسیٰ اشعریؓ گھبرائے ہوئے آئے۔ لوگوں نے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ میں ان سے ملوں۔ میں ان کے مکان پر گیا اور تین مرتبہ میں نے اجازت مانگی مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر کار میں لوٹ آیا۔ حضرت عمرؓ نے مجھ سے جواب طلب کیا کہ تم ان سے کیوں نہیں ملا؟ میں نے کہا کہ میں آیا تھا اور میں نے تین مرتبہ آپ کے دروازہ پر سلام کیا مگر آپ میں سے کسی نے جواب نہیں دیا اس لئے میں لوٹ آیا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی تم میں سے تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ دی جائے تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ اس پر حضرت عمرؓ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنا گواہ پیش کرو جس نے تمھارے ساتھ رسول اللہ صلعم سے یہ بات سنی ہو۔ لوگوں نے کہا کہ اپنے میں سے سب سے کم عمر آدمی کو شہادت دینے کے لئے بھیجو۔ چنانچہ ابو سعیدؓ ان کے ساتھ گئے اور انھوں نے جاکر شہادت دی۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰؓ سے فرمایا۔ میں تمھیں متہم نہیں سمجھتا تھا مگر یہ رسول اللہ صلعم کی حدیث کی بات تھی۔ حضرت علیؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی ان سے رسول اللہ صلعم کی حدیث بیان کرتا تو وہ اس سے حلف لیا کرتے تھے۔

فتنۂ وضعِ حدیث

ابتدائی زمانوں میں رسول اللہ صلعم کی حدیثیں کسی خاص کتاب میں مدوّن نہیں کی گئیں۔ اور لوگوں نے محض اپنے حافظہ پر اعتماد کرنے پر اکتفا کیا۔ ابتداء وحی سے وفات تک تیئیس سال کے عرصہ میں آپ نے جو کچھ فرمایا اور کیا ان سب کو جمع کر لینا انتہائی دشوار بھی تھا۔ ان وجوہ سے کچھ لوگوں نے اپنے سے حدیثیں گھڑنے اور جھوٹ موٹ رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرنے کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حدیثیں گھڑنے کا یہ سلسلہ خود رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ حدیث کہ "جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے" غالب گمان یہی ہے کہ کسی ایسے حادثہ میں فرمائی گئی ہو گی جس میں رسول اللہ صلعم پر جھوٹ باندھا گیا ہو گا۔ آپ کی وفات کے بعد تو آپ پر جھوٹ باندھنا اور بھی آسان تھا کیونکہ اب خود آپ سے اس کی تصدیق کرنا دشوار تھا۔ مسلم نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "ہم اس زمانہ میں رسول اللہ صلعم سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے جب آپ پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے ہر نرم و سخت زمین پر گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے رسول اللہ صلعم سے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دیں۔" ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ بشیر عدوی ابن عباسؓ کے پاس آئے اور حدیثیں بیان کرنے لگے۔ ہر بات میں وہ قال رسول اللہ۔ قال رسول اللہ کی تکرار کر رہے تھے۔ مگر ابن عباسؓ ان کی طرف نہ تو دھیان دے رہے تھے اور نہ ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس پر بشیر عدوی نے کہا کہ اے ابن عباسؓ کیا بات ہے۔ تم میری حدیثیں نہیں سنتے؟ میں رسول اللہ صلعم کی حدیثیں بیان کر رہا ہوں اور تم ادھر ادھر دیکھ رہے ہو۔ اس پر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے سنتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے یوں فرمایا تو ہماری نگاہیں تیزی سے اس کی طرف اٹھ جاتیں اور کان اس کی طرف لگ جاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ لوگوں نے ہر نرم

دسخت پر سواری شروع کر دی ہے تو ہم لوگوں سے صرف وہی باتیں قبول کرتے ہیں جن کے متعلق ہم جانتے ہوں کہ وہ واقعی رسول اللہؐ کی باتیں ہیں۔[1] سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے پاس ایک کتاب لائی گئی جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے جمع کئے گئے تھے تو آپ نے ایک ہاتھ (ذراع) کے بقدر چھوڑ کر ساری کتاب کو مٹا ڈالا۔[1] مطلب یہ ہے کہ اس طول طویل دستاویز میں جو کچھ درج تھا وہ سب کا سب حضرت علیؓ کے ذمہ جھوٹ کا پلندہ تھا۔ البتہ ایک ہاتھ کے بقدر صحیح تھا۔ اور جتنا کچھ ابن عباسؓ نے مٹا دیا تھا وہ سب جھوٹ تھا — پھر جب فتوحات بڑھیں اور مفتوحہ اقوام کے بے شمار لوگ۔ ایرانی، رومی، بربری۔ مصری، شامی وغیرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ جن میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترا تھا تو حدیثیں گھڑنے کا

وضع حدیث کی گرم بازاری

رواج خوفناک حد تک بڑھ گیا اور ہر طرف اس کی گرم بازاری ہونے لگی۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ جب عبد الکریم ابن ابی العوجاء وضاع کو گرفتار کیا گیا تاکہ اس کی گردن ماردی جائے تو اس نے یہ بیان دیا تھا۔ "میں نے تمہارے اندر چار ہزار ایسی حدیثیں پھیلا دی ہیں جن میں حلال و حرام کے احکام بیان کئے ہیں"۔ یہ عبد الکریم معن ابن زائدہ کا ماموں تھا اور مانوی مذہب کا پیرو ہونے کی اس پر تہمت تھی۔ وہ بے شمار حدیثیں ایسی ایسی سندوں سے گھڑا کرتا تھا کہ جنہیں جرح و تعدیل کی پوری معرفت نہ ہو وہ اکثر دھوکہ کھا جاتے تھے۔ یہ تمام حدیثیں جو اس نے وضع کی تھیں گمراہیوں سے پُر تھیں۔ ان میں تشبیہ (خدا فلاں چیز جیسا ہے) اور تعطیل (خدا تخلیق کائنات کے بعد معطل ہو کر بیٹھ گیا ہے) جیسی باتیں بیان کی گئی تھیں اور بعض حدیثوں میں شریعت کے احکام کو بدل دیا گیا تھا۔[2] حدیثیں کس کثرت سے گھڑی گئیں اس مقدار کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ تفسیر سے متعلق احادیث — جن کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ نے یہ فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک ان میں سے کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے — ہزار ہا ہزار کی تعداد تک پہنچی ہیں۔ امام بخاری کی کتاب سات ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے جن میں سے تین ہزار تعداد میں مکرر ہیں۔ محدثین کا بیان ہے کہ یہ وہ حدیثیں تھیں جو امام بخاریؒ کے خیال میں صحیح قرار پائیں اور جنہیں انھوں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے زمانہ میں عام طور سے متداول تھیں منتخب کیا تھا۔ سفیان کہتے ہیں کہ میں نے جابر سے تقریباً تیس ہزار حدیثیں سنی ہیں جن میں سے ایک حدیث کو بیان کرنا بھی میں جائز نہیں سمجھتا خواہ اس کے عوض مجھے کتنی ہی بڑی نعمت کیوں نہ دیدی جائے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ بعض حدیثیں گھڑنے والے رسول اللہ صلعم کے متعلق حدیثیں گھڑنے کو اخلاقی نقص یا دینی جرم نہیں سمجھتے تھے۔ امام مسلم نے محمد بن یحییٰ ابن سعید القطان سے نقل کیا ہے کہ ان کے والد فرماتے تھے کہ ہم نے ان

نیک اور صالح مگر سب سے زیادہ جھوٹے

نیک اور صالح لوگوں کو حدیث سے زیادہ اور کسی چیز میں اس قدر جھوٹا نہیں دیکھا۔ امام مسلم نے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ لوگ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے تھے مگر جھوٹ ان کی زبانوں پر خود ہی چڑھ جاتا تھا۔ ان میں سے بعض لوگ نیک نیت بھی ہوتے تھے۔ یعنی جو کچھ ان کے سامنے آتا تھا اسے صحیح سمجھ کر جمع کر لیتے تھے۔ وہ خود تو سچے ہوتے تھے کہ جو کچھ سنتے تھے اسے بیان کر دیتے تھے مگر لوگ ان کی سچائی سے دھوکہ کھا کر ان کی بیان کردہ باتوں کو قبول کر لیتے تھے۔ مثلاً عبد اللہ ابن المبارک کے بارہ میں یہی

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح مسلم [3] شرح مسلم الثبوت [4] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۰۰

کچھ کہا جاتا ہے کہ وہ خود تو ثقہ اور سچے بزرگ تھے لیکن وہ ہر آنے جانے والے سے حدیثیں لے لیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس میں تو احتیاط برتتے تھے کہ بات فی نفسہ غلط نہیں ہونی چاہیئے لیکن اگر بات حق ہوتی تو پھر وہ اس کی نسبت رسول اللہ صلعم کی طرف کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ خالد بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن سعید دمشقی کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے کہیں کوئی اچھی بات ملتی ہے تو میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے ایک اچھی سی سند گھڑ دوں۔ ابو جعفر ہاشمی مدنی ایسی ہی سچی باتوں کی حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ترغیب و ترہیب میں حدیثیں گھڑنے کو بالکل جائز قرار دے رکھا تھا۔ امام نووی نے کہا ہے کہ ان لوگوں کے مسلک پر وہ جاہل لوگ چلے جو زہاد کا جامہ پہنے ہوتے تھے کہ وہ اپنے باطل گمان میں بھلی باتوں کی ترغیب دلانے کے لئے ایسا کرتے تھے۔

بہرحال حدیثیں گھڑنے کا رواج بہت زیادہ تھا اور جو امور ان حدیثیں گھڑنے والوں کو اس ناپاک کاروبار پر ابھارتے تھے ان میں سے اہم ترین امور یہ تھے۔

وضع حدیث کے اسباب

(۱) سیاسی جھگڑے۔ چنانچہ حضرت علی رضؓ اور حضرت ابوبکر رضؓ کے درمیان جھگڑا، حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جھگڑا، عبداللہ ابن الزبیرؓ اور عبدالملک کے درمیان جھگڑا، پھر بنو امیہ اور بنو عباسؓ کے درمیان جھگڑا یہ سب بے شمار حدیثیں گھڑنے کا موجب بنے۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغت میں لکھا ہے کہ "فضائل کی حدیثوں میں جھوٹ بولنے کی ابتدا شیعوں کی طرف سے ہوئی۔ ابتدا شیعوں نے اپنے صاحب (حضرت علیؓ) کی شان میں مختلف حدیثیں گھڑیں۔ دشمنوں کی عداوت نے انھیں یہ حدیثیں گھڑنے پر مجبور کیا۔ مثلاً حدیث سطل۔ حدیث رمانہ۔ حدیث غزوۃ البئر جس میں شیاطین رہتے تھے...... اور حدیث غسل سلمان فارسی۔ اور حدیث طی الارض اور حدیث جمجمہ وغیرہ۔ جب حضرت ابوبکر رضؓ کے حامیوں نے شیعوں کی یہ حرکات دیکھیں تو ان حدیثوں کے مقابلہ میں انھوں نے بھی اپنے صاحب (ابوبکرؓ) کی شان میں حدیثیں گھڑنی شروع کر دیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ "اگر میں کسی کو دوست بنانے والا ہوتا...... الخ یہ حدیث ان لوگوں نے حدیث الاخا کے مقابلہ میں گھڑی تھی۔ نیز دروازے بند کرنے والی حدیث کہ وہ دراصل حضرت علیؓ کے متعلق تھی۔ ابوبکر رضؓ کے حامیوں نے اسے ابوبکر رضؓ کے حق میں پلٹ دیا۔ جب شیعوں نے ابوبکر رضؓ کے حامیوں کی یہ گھڑی ہوئی حدیثیں دیکھیں تو انھوں نے حدیثیں گھڑنے میں اور وسعت پیدا کر لی۔ چنانچہ انھوں نے لوہے کے طوق والی حدیث گھڑی جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ خالد کی گردن میں ڈالا گیا تھا...... اور اس صحیفہ کی حدیث جو فتح مکہ کے سال خانہ کعبہ پر لٹکایا گیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی جھوٹی حدیثیں جن سے اکابر صحابہؓ اور تابعین اولین کا نفاق اور کفر ثابت کیا جاتا ہے اور ان کا وزن بہت ہی ہلکا کیا جائے تو کم از کم ان کا فسق تو ثابت ہو ہی جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر رضؓ کے حامیوں نے ایسی حدیثیں گھڑیں جن سے حضرت علی اور ان کے صاحبزادگان پر بہت سے مطاعن ثابت ہوتے تھے۔ کبھی حضرت علیؓ کو ضعف قلب کی طرف منسوب کیا گیا اور کبھی ضعف سیاست کی طرف۔ کبھی ان کی حب دنیا اور حرص دنیا کا ثبوت دیا گیا۔ حالانکہ دونوں فریقوں کو اس قسم کی بیہودہ حدیثیں گھڑنے اور اپنے آپ کو ملوث کرنے کی

۱؎ مسلم ۲؎ نووی شرح مسلم ص ۳۳ ج ۱ ۳؎ مسلم

کوئی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت علیؓ کے فضائل میں ثابت اور صحیح حدیثیں ایسے ہی حضرت ابوبکرؓ کے فضائل میں محقق اور معلوم و مشہور حدیثیں اس کثرت سے موجود تھیں جو اس عصبیت کے تکلف سے بے نیاز کر دینے کے لئے کافی تھیں۔[1]

بہت سی ایسی حدیثیں آپ کو نظر آئیں گی جنہیں پڑھتے ہی آپ کو یقین ہو جائے گا کہ وہ حدیثیں جو امیہ، بنو عباس یا بنو علی کی تائید میں یا ان کا رتبہ گھٹانے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے امیر معاویہؓ کے بارہ میں فرمایا۔ اے اللہ اسے عذاب اور حساب سے بچانا اور کتاب اللہ کا علم عطا فرمانا۔ یا مثلاً وہ روایت کہ عمرو بن العاصؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ آل ابی طالب میرے ولی اور مددگار نہیں ہیں۔ میرے ولی اور مددگار اللہ اور صالح مومنین ہیں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے وہ بیشتر حدیثیں جو فضائل صحابہؓ میں گھڑی گئی ہیں بنو امیہ کے زمانہ میں بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ لوگ اس طرح ان کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان حدیثوں کے ذریعے سے وہ بنو ہاشم کی ناک کاٹ سکتے ہیں۔

اسی قسم کی وہ حدیثیں بھی ہیں جو گھڑنے والوں نے عربی قبائل کی فضیلت میں گھڑی ہیں۔ بات یہ تھی کہ یہ قبائل ریاست، فخر اور شرف میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان احادیث میں انہیں اپنی اس مفاخرت کے لئے راستہ مل جاتا تھا جیسا کہ اشعار کے ذریعہ سے ان کے ہاں اب تک ہوتا آیا تھا۔ چنانچہ بے شمار حدیثیں ہیں جو قریش، انصار، جہینہ، مزینہ، اسلم، غفار، اشعریین اور حمیریین کی فضیلت میں گھڑی گئیں۔

بہت سی حدیثیں عجمیوں، اور دیلمیوں پر عربوں کی فضیلت میں گھڑی گئیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں نے عجمیوں، رومیوں، اور ترکوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑیں۔[2]

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ص ۱۷ ج ۳ باختصار [2] تیسیر الوصول کے تیسرے باب میں اس قسم کی حدیثیں دیکھئے۔

اقبال اور قرآن

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات ـــــ کا مجموعہ

قیمت دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ ـــــ لاہور

یہی حال شہروں کے لئے عصبیت کا ہے۔ آپ کو کوئی بڑا شہر نہیں ملے گا جس کی فضیلت میں ایک یا چند حدیثیں نہ مل جائیں۔ مکہ، مدینہ، جبل احد، حجاز، یمن، شام، بیت المقدس، مصر، فارس، وغیرہ سب کی فضیلت میں متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ مختصراً یہ کہ جماعتی، قبائلی اور وطنی عصبیت بھی حدیثیں گھڑنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب تھا۔

(۲) کلامی اور فقہی اختلافات: مثلاً قدر یا جبر (اختیار) کے مسئلہ میں علمائے کلام کا اختلاف ہوا۔ کچھ لوگوں نے اپنے لئے اس بات کو جائز قرار دے لیا کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں حدیثیں گھڑ کر پیش کریں۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان میں دقیق تفصیلات تک صراحتہً بیان کر دیں جن سے تعرض کرنا رسولوں کا مسلک ہی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو صراحت کے ساتھ اس فرقہ کا نام تک لے دیا گیا ہے جو اس مسئلہ کے لئے نبرد آزما ہوگا۔ بلکہ اس فرقہ کے سردار کا نام بھی صراحت کے ساتھ لے دیا گیا اور اس پر لعنت برسائی گئی۔

یہی کچھ فقہ میں ہوا ہے۔ چنانچہ آپ کو کوئی ایسا فقہی مختلف فیہ مسئلہ نہیں ملے گا جس کی تائید میں حدیثیں موجود نہ ہوں۔ کچھ حدیثیں اس کی تائید میں ملیں گی تو کچھ اس کی تائید میں۔ آپ ذرا اس نکتہ پر غور کیجئے علماء کا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بہت تھوڑی سی حدیثیں صحت کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے کہا ہے کہ امام صاحب موصوف کے نزدیک صرف سترہ[۱] حدیثیں صحت کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ اس کے برعکس آپ دیکھئے کہ مذہب حنفی کی کتابیں بے شمار حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔ بسا اوقات تو وہ کسی مسئلہ کے متعلق اتنی صریح ہیں کہ انھیں پڑھ کر فقہی متون کی عبارت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس نہج پر حدیثیں گھڑنے کی مثالیں پیش کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم اس قدر اشارہ کر دینے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۳) امراء اور خلفاء کی خواہشات کی پیروی میں بھی حدیثیں وضع کی گئیں۔ یہ فعل شنیع بعض مدعیانِ علم سے سرزد ہوا۔ کہ وہ ان کے پسند کی چیزیں حدیثوں میں گھڑ گھڑ کر پیش کرتے تھے تاکہ انھیں مال و دولت کی فراوانی اور ان کا تقرب حاصل ہو سکے مثلاً غیاث ابن ابراہیم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مہدی ابن المنصور کے پاس گیا۔ مہدی کو کبوتر اڑانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے فوراً ایک حدیث بیان کر دی کہ مسابقت صرف تین چیزوں میں جائز ہے اونٹوں میں، گھوڑوں میں اور پرندوں میں۔ مہدی نے اسے دس ہزار درہم انعام دینے کا حکم دیا۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو مہدی نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری گدی ایک ایسے جھوٹے کی گدی ہے جس نے رسول اللہ صلعم پر جھوٹ بولا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس حدیث میں پرندوں کی مسابقت کے متعلق کچھ نہیں فرمایا تھا لیکن تم نے ہمارا تقرب حاصل کرنے کی خاطر ایسا بیان کیا ہے"۔

علماء نے فضائل اور ترغیب و ترہیب وغیرہ ابواب میں تساہل سے کام لیا۔ کیونکہ ان سے حلال و حرام کے مسائل مستنبط نہیں ہوتے تھے۔ نہ ان سے کوئی حرام چیز حلال ہو جاتی تھی نہ حلال چیز حرام۔ انھوں نے ان موضوعات میں حدیثیں گھڑنے کو جائز قرار دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف اشخاص کی فضیلت میں حدیثیں گھڑ لی گئیں اور کتابیں ان سے بھر گئیں۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کی فضیلت میں بھی جنھیں رسول اللہ صلعم نے دیکھا بھی نہیں تھا مثلاً وہب بن منبہ وغیرہ اس طرح قرآن کی آیتوں اور

---

[۱] شرح مسلم الثبوت ص ۱۵۲، ج ۲

سورتوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑی گئیں۔ مثلاً ابو عصمہ نوح بن ابی مریم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کی ایک ایک سورۃ کے متعلق اس عنوان سے حدیثیں گھڑی ہیں کہ جو شخص فلاں سورت پڑھے گا اسے یہ کچھ حاصل ہوگا۔ اور وہ ان تمام حدیثوں کو عکرمہ کے واسطہ سے ابن عباسؓ سے اور بعض اوقات ابی بن کعبؓ سے روایت کرتا ہے۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جو تفسیر بیضاوی میں ہر سورۃ کے خاتمہ پر نقل کی گئی ہیں ----- جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ تمام حدیثیں تم کہاں سے لائے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ابو حنیفہؒ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی پر جھکے پڑتے ہیں اور قرآن حفظ کرنے کا انہیں کچھ بھی شوق نہیں رہا تو میں نے ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ حدیثیں گھڑ دیں۔[1]

اسی طرح کتب اخلاق و تصوف میں آپ کو ترغیب و ترہیب کے لئے بے شمار موضوع حدیثیں ملیں گی۔ ساتھ ہی قصہ گو واعظوں نے بھی حدیث میں بے شمار گھڑی ہوئی موضوعات شامل کر دی ہیں۔

وضعِ حدیث کا اہم ترین سبب

(۵) میں سمجھتا ہوں کہ حدیثیں گھڑنے کا اہم ترین سبب اس زمانہ میں لوگوں کا یہ غلو بھی تھا کہ وہ علم کی کوئی بات اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک اس کا رشتہ مضبوطی کے ساتھ کتاب و سنت کے ساتھ نہ جوڑ دیا جائے۔ اس کے بغیر کسی علمی بات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی تھی۔ حلال و حرام کے احکام جب خالصۃً اجتہاد پر مبنی ہوتے تو ان کی وہ قیمت نہیں ہوتی تھی جو ان احکام کی ہوتی تھی جن کی بنیاد حدیث یا آثار صحابہ پر ہوتی تھی۔ بلکہ اس زمانہ کے اکثر علماء ایسے احکام کی کوئی قیمت سمجھتے ہی نہ تھے اور نہ قبول کرتے تھے۔ بلکہ بعض علماء تو ایسا کرنے والوں پر سخت طعن و تشنیع کرتے تھے۔ اگر حکمت اور موعظت حسنہ کی کوئی بات کسی ہندی، یونانی یا ایرانی اصل سے ہوتی یا تورات و انجیل کی شروح میں سے ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اس چیز نے لوگوں کو زیادہ تر اس بات پر ابھارا کہ وہ اس طرح کی باتوں کو بھی دینی رنگ دیدیں تاکہ لوگ ان پر توجہ کریں۔ انہیں اور کوئی رستہ ملتا نہیں تھا۔ حدیث ہی کا ایک دروازہ تھا جس کے دونوں کواڑ چوپٹ کھلے ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ اس دروازہ سے لوگوں پر داخل ہوئے اور خدا کا خوف بھی ان کے آڑے نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آپ کو عقلی احکام فقہیہ، ہندی حِکَم، زردشتی فلسفہ، اسرائیلی اور نصرانی مواعظ کی قسم کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔

رسول اللہ صلعم کی احادیث میں اس بدنظمی (Anarchy) نے سچے علماء کی ایک جماعت کو سخت پریشان کیا۔ چنانچہ

موضوع احادیث کو چھانٹنے کی کوشش

وہ حدیث کی تطہیر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ عمدہ اور صحیح حدیثوں کو ضعیف اور موضوع حدیثوں سے الگ کر سکیں۔ اس کے لئے انہوں نے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا۔

چنانچہ انہوں نے ہر حدیث کے لئے سند کا مطالبہ کیا۔ یعنی یہ ضروری قرار دیا کہ راویوں کو متعین کر کے بتایا جائے کہ ان سے کن لوگوں نے بیان کیا۔ چنانچہ ہر حدیث بیان کرنے والے کو کہنا پڑتا کہ مجھ سے فلاں نے حدیث بیان کی اور اس سے فلاں نے بیان کی کہ رسول اللہ صلعم نے یوں فرمایا تھا تاکہ اس طرح محدث کے صدق اور کذب کی قیمت کا اندازہ لگایا جا سکے اور دیکھا جا سکے

[1] شرح مسلم ص ۱۳۰ ج ۲

کہ حدیث بیان کرنے والا کسی بدعت کی طرف تو منسوب نہیں کہ اپنی اس بدعت کو رواج دینے کے لئے اس نے حدیث وضع کر لی ہو۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ابن سیرینؒ نے فرمایا۔ لوگ سند کا سوال نہیں کیا کرتے تھے لیکن فتنے اٹھنے لگے تو لوگوں کو کہنا پڑا کہ ان آدمیوں کے نام بتاؤ جن سے تم حدیثیں بیان کرتے ہو تاکہ دیکھا جائے کہ بیان کرنے والے اہل سنت میں سے تھے یا نہیں تاکہ ان کی حدیثیں قبول کی جائیں اور اہل بدعت کی حدیثیں رد کر دی جائیں۔[1]

اس کے بعد انہوں نے راویوں کی چھان بین شروع کی اور بعض کو مجروح اور بعض کو ثقہ اور قابل اعتماد قرار دیا اور انہوں نے اپنے ذمہ لازم قرار دے لیا کہ وہ راویانِ حدیث اور ناقلین اخبار کے عیوب کی تحقیق و تفتیش کریں گے۔

صحابہ کے متعلق ناقدین حدیث کا اختلاف رائے

ان ناقدین سند نے زیادہ تر تمام صحابہؓ کو اجمالاً اور تفصیلاً قابلِ اعتماد شمار کیا ہے۔ چنانچہ کسی پر انہوں نے خوردہ گیری نہیں کی اور نہ کسی کو جھوٹا کہا۔ لیکن کچھ علماء نے کہا کہ صحابہؓ کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے لوگوں کا ہے۔ غزالیؒ نے کہا ہے کہ جس مسلک پر امت کے سلف اور جماہیر خلف چلتے آئے ہیں وہ یہی ہے کہ صحابہؓ سب قابلِ اعتماد ہیں۔ کیونکہ خدا نے ان کو قابل اعتماد قرار دیا اور اپنی کتاب میں ان کی ثناء اور توصیف فرمائی ہے۔ یہی ان کے بارہ میں ہمارا عقیدہ ہے بجز اس صورت کے کہ کسی دلیل قطعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں صحابیؓ جان بوجھ کر کسی فسق کے مرتکب ہوئے تھے اور ظاہر ہے کہ کسی صحابیؓ کے متعلق اس کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ لہٰذا ان کی چھان بین کرنے کی ضرورت ہی نہیں...... بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چھان بین کرنے کے لئے صحابہ کا حال وہی ہے جو دوسرے لوگوں کا ہے۔ ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ ابتداء میں تمام صحابہ قابل اعتماد تھے لیکن باہمی جنگ اور جھگڑے ظاہر ہونے کے بعد حالت بدل گئی تھی اور خون بہائے جانے لگے تھے لہٰذا چھان بین اور تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے صحابیؓ کے لفظ کی تفسیر ہی بدل کر ڈالی کہ صحابیؓ اس کو کہیں گے جو طویل عرصہ تک رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہا ہو۔[2]

صحابہ ایک دوسرے پر تنقید کرتے اور حدیثیں رد کر دیتے تھے

یہ ظاہر ہے کہ خود صحابہؓ اپنے زمانہ میں ایک دوسرے پر تنقید کرتے اور ایک کو دوسرے سے بلند مرتبہ پر رکھ دیتے تھے۔ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ صحابہؓ میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جب ان کے سامنے کوئی حدیث بیان کی جاتی تھی تو وہ شہادت اور دلیل طلب کرتے تھے بلکہ روایات میں تو یہاں سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ "جو شخص جنازہ اٹھا کر آئے اسے وضو کرنا چاہیئے" ابن عباسؓ نے اس حدیث کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ "ہم پر چند خشک لکڑیوں کو اٹھانے کی وجہ سے وضو واجب نہیں ہو سکتا" اسی طرح انہوں نے یہ حدیث بیان کی جو صحیحین میں موجود ہے کہ "جب تم میں سے کوئی نیند سے جاگے تو برتن میں ہاتھ ڈالنے

---

[1] یعنی ثقاہت کی پہلی شرط ہم عقیدگی قرار پا گئی۔ اس بنیادی کمزوری اہل علم پر واضح ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] المستصفیٰ ص ۱۶۵ ج ۱

سے پہلے اپنے ہاتھ دھولے کیونکہ تمھیں معلوم نہیں کہ رات بھر تمھارے ہاتھ کہاں کہاں جاتے رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہؓ نے اس روایت کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ "ہمارے گھروں میں پتھر کے بڑے بڑے برتن پانی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں جنھیں اٹھانا تو درکنار ہلانا بھی دشوار ہے۔ ہم ایسے برتنوں کا کیا کر سکتے ہیں"۔ اور مثلاً فاطمہ بنت قیسؓ نے یہ روایت بیان کی کہ ان کے شوہر نے انھیں بائنہ طلاق دیدی تھی تو رسول اللہ صلعم نے انھیں نہ نفقہ دلوایا تھا اور نہ رہنے کی جگہ، بلکہ ان سے فرمایا تھا کہ تم ابن ام مکتوم کے مکان میں عدتؓ گذار لو۔ کیونکہ وہ نابینا آدمی ہیں۔ لیکن امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس روایت کو رد کر دیا اور فرمایا کہ ہم اپنے پروردگار کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کو ایک عورت کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔ اسے بات یاد ہے یا وہ بھول گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فاطمہ بنت قیس سے فرمایا کیا تو خدا سے نہیں ڈرتی ...... [1] اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

بہر حال اکثر ناقدین حدیث اور خصوصیت کے ساتھ متاخرین کا جس پر عمل رہا ہے وہ یہی ہے کہ یہ لوگ تمام صحابہؓ کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ اور ان میں سے کسی کو جھوٹ اور حدیث گھڑنے کے ساتھ متہم نہیں کرتے۔ یہ لوگ صحابہؓ کے بعد دوسرے لوگوں کی جرح اور تعدیل کرتے ہیں۔ جرح اور تعدیل کے ساتھ کلام کرنا صحابہؓ ہی کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ۔ عبادہؓ ابن الصامت۔ انس بن مالکؓ کے اقوال اس بارہ میں نقل کئے جاتے ہیں۔ تابعین کے عہد میں جرح و تعدیل کا سلسلہ کثرت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ چنانچہ شعبی، ابن سیرین، حسن بصری اور سعید بن المسیب وغیرہ کے اقوال بکثرت ملتے ہیں اور ان کے بعد تو یہ سلسلہ بہت ہی کثرت کے ساتھ چل پڑا۔

جرح وتعدیل پر مذہبی اختلافات کا اثر

جرح وتعدیل میں مذہبی اختلافات کا بھی بڑا اثر تھا۔ اہل سنت اکثر اہل شیعہ پر جرح کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے تصریح کر دی ہے کہ حضرت علیؓ کی وہ تمام روایات ناقابل اعتبار ہیں جنھیں ان سے ان کے ساتھیوں اور شیعوں نے نقل کیا ہو۔ صرف وہ روایات ہی قبول کی جا سکتی ہیں جو حضرت علیؓ سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگردوں نے نقل کی ہوں۔ بعینہٖ یہی حال اہل سنت کے بارہ میں اہل تشیع کا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ صرف انہی روایات پر اعتماد کرتے ہیں جو شیعوں نے اہل بیت سے نقل کی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسے ایک جماعت قابل اعتماد قرار دیتی تھی اسے دوسرے لوگ ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ذہبی نے کہا ہے کہ اس شان کے دو عالموں نے کسی ضعیف راوی کو ثقہ قرار دینے اور ثقہ کو ضعیف قرار دینے پر اتفاق نہیں کیا، جہاں ذہبی کے اس قول میں بڑا مبالغہ ہے وہیں اس سے ہمیں یہ بھی

جرح وتعدیل میں ائمہ کا باہم اختلاف

معلوم ہو جاتا ہے کہ جرح وتعدیل میں زاویہ ہائے نظر کا کس قدر اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس کی توضیح کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں ــــ محمد بن اسحاقؒ

---

[1] شرح نووی علی مسلم اور شرح مسلم الثبوت۔

لے لیجئے ——— اسلام کے ابتدائی حوادث و وقائع میں یہ سب سے بڑے مورخ ہیں ... ان کے بارہ میں قتادہ کہتے ہیں۔" اس وقت تک لوگوں میں برابر علم رہے گا جب تک محمد بن اسحاق زندہ ہیں": لیکن نسائی کہتے ہیں کہ محمد ابن اسحاق قوی راوی نہیں ہیں: سفیان کہتے ہیں کہ "میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو محمد بن اسحاق کو متہم سمجھتا ہو": لیکن دارقطنی کہتے ہیں کہ "محمد بن اسحاق اور ان کے باپ کی کسی روایت سے دلیل نہیں لائی جا سکتی": امام مالک فرماتے ہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد بن اسحٰق بالکل جھوٹا تھا:..... الخ

سند کی تنقید تو کی گئی مگر متن کی تنقیح بالکل نہیں کی گئی

علماء نے جرح و تعدیل کے قواعد مقرر کئے ہیں مگر بیان انھیں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علماء نے سند کی تنقید پر اس سے کہیں زیادہ زور دیا جتنا متن کی تنقید پر۔ آپ شاذ و نادر ہی اس طرح کی تنقید کہیں پائیں گے کہ رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر کے جو بات بیان کی گئی ہے وہ ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتی جن میں وہ کہی گئی ہے یا تاریخی حوادث جو مسلّمہ ہیں وہ اس کے خلاف ہیں[1] یا حدیث کی عبارت فلسفیانہ تعبیر سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور ایک نبی کی تعبیر کے عام طریقہ کے خلاف ہے یا حدیث کی عبارت اپنی قیود و شرائط میں متونِ فقہ سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ جس قدر اہتمام انھوں نے راویوں کی جرح و تعدیل کا کیا ہے متن کے سلسلہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا گیا حتیٰ کہ امام بخاری جیسا جلیل القدر اور دقیق النظر امام بھی اپنی صحیح میں ایسی احادیث کو درج کرتا چلا جاتا ہے جنھیں زمانہ کے حوادث اور تجربی شہادات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ غلط ہیں[2]۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ انھوں نے محض راویوں کی تنقید پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً اس حدیث کو دیکھئے کہ "سو سال کے بعد روئے زمین پر کوئی متنفس باقی نہیں رہے گا": اور "جو آدمی صبح اٹھتے ہی عجوہ کھجور کے سات دانے کھالے اسے زہر اور سحر سارے دن رات ہونے تک کوئی نقصان نہیں دے سکتا":

حدیث متواتر و آحاد

محدثین نے قوت اور قبولیت کے اعتبار سے حدیث کو کئی قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کا الگ الگ نام رکھا ہے۔ اوّل تو انھوں نے یہ تقسیم کی کہ وہ متواتر اور آحاد ہوتی ہیں۔ متواتر ان روایات کو کہتے ہیں جنھیں ایک بڑی جماعت نے نقل کیا ہو جس کا جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لینا متوقع نہ ہو۔ اور آگے سے رسول اللہ صلعم تک ہر زمانہ میں ایسی ہی بڑی جماعت نقل کرتی آ رہی ہو۔ اس قسم کی حدیث علم و یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ مگر علماء کی بڑی جماعت نے کہا ہے کہ اس قسم کی حدیثیں پائی نہیں جاتیں۔ دوسرے لوگوں نے صرف اس حدیث کو متواتر شمار کیا ہے کہ "جو کوئی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے": کچھ لوگوں نے اس میں چند اور حدیثوں کا بھی اضافہ کیا ہے مگر وہ سب مل کر بھی سات سے آگے نہیں بڑھتیں۔ رہ گئیں احادیث آحاد تو وہ غیر متواتر ہوتی ہیں۔ یہ روایات اکثر علماء اصول اور فقہاء کے نزدیک علم و یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ صرف اتنا ہے کہ جب ان کا سچا ہونا راجح ہو تو ان پر عمل کر لینا جائز ہے۔ پھر انھوں نے احادیث آحاد کو بھی ان کی قوت کے اعتبار سے کئی درجوں میں تقسیم کر دیا ہے جن کو بیان کر کے ہم مضمون کو طویل کرنا نہیں چاہتے۔

---

[1] سب سے مقدم یہ کہ وہ حدیث قرآن کے خلاف تو نہیں۔ (طلوع اسلام) [2] حتیٰ کہ ایسی حدیثیں بھی جو قرآن کے خلاف ہیں۔ (طلوع اسلام)

قلت و کثرت روایات کے اعتبار سے صحابہ کے درجے

رسول اللہ صلعم سے حدیثیں بیان کرنے میں قلت اور کثرت کے اعتبار سے صحابہؓ کے مختلف درجے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والے ابوہریرہؓ، ام المومنین عائشہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباسؓ اور انس ابن مالک رضی اللہ عنہم ہیں۔ چنانچہ ابوہریرہؓ کی روایات ۵۳۷۴ تک پہنچتی ہیں اور حضرت عائشہؓ کی روایات ۲۲۱۰ تک پہنچتی ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور انس بن مالک کی روایات حضرت عائشہؓ کی روایات کے لگ بھگ ہیں اور حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایات ۱۵۰۰ سے زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس، ہمیں حضرت عمر بن الخطابؓ کی روایات تقریباً ۵۳۷ ملتی ہیں جن میں سے صحیح حدیثیں پچاس سے زیادہ نہیں۔ جن لوگوں کی روایتیں زیادہ ہیں ان کی کثرت روایت کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ یہ حضرات رسول اللہ صلعم کے بعد زیادہ عرصہ تک زندہ رہے اور بہت سے بڑے بڑے صحابہؓ سے انھیں استفادہ کا موقعہ ملا۔

حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یمنی الاصل ہیں اور قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن ہے۔ ان کا لقب ابوہریرہ اس چھوٹی سی بلی کی وجہ سے پڑ گیا تھا جو انھوں نے پالی ہوئی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ میری ایک چھوٹی سی بلی تھی۔ اسے رات کو میں ایک درخت میں رکھ دیتا اور دن کے وقت اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور اس سے کھیلا کرتا۔ لہذا لوگوں نے میری کنیت ابوہریرہ رکھ دی۔" ہجرت کے ساتویں سال میں اسلام لائے اور برابر حضورؐ کے ساتھ رہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے انھیں بحرین کا گورنر بنایا اور پھر معزول کر دیا۔ اس کے بعد پھر انھیں کسی کام پر لگانا چاہا مگر حضرت ابوہریرہ نے انکار کر دیا۔ مدینہ منورہ میں رہتے تھے وہیں تقریباً ۵۹ھ میں انتقال فرمایا۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب "المعارف" میں لکھتے ہیں کہ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے یتیمی میں نشوونما پائی۔ مسکینی میں ہجرت کی۔ بسرہ بنت غزوان کے ہاں میں پیٹ بھر کھانے اور ایک جوڑی جوتے کے بدلے مزدوری کیا کرتا تھا۔ جب وہ لوگ کہیں قیام کرتے تو ان کی خدمت کرتا اور سفر کرتے تو ان کے اونٹوں کے لئے حُدی خوانی کیا کرتا۔ خدا نے بسرہ بنت غزوان سے میری شادی کرا دی۔ اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے دین کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ بنایا اور ابوہریرہ کو امام کر دیا۔" ابن قتیبہ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ نہایت خوش مزاج آدمی تھے اور پھر ان کے کچھ لطائف و ظرائف نقل کئے ہیں۔[2]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رسول اللہ صلعم سے سب سے زیادہ حدیثیں انھوں نے ہی بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے نہیں تھے بلکہ زبانی حافظہ پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنی روایات کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے جو انھوں نے رسول اللہ صلعم سے سنی تھیں بلکہ ایسی روایتیں بھی بیان کرتے تھے جو دوسرے صحابہؓ کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ "رسول اللہ صلعم نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے تو اس کا روزہ نہیں" حضرت عائشہؓ

لہ اسد الغابہ   سلہ معارف صفحہ ۹۴

نے اس حدیث کا انکار فرمایا اور کہا کہ رسول اللہ صلعم کو رمضان میں فجر ہو جایا کرتی تھی اور آپ (بغیر احتلام کے) جنابت کی حالت میں ہوتے تھے۔ غسل فرما کر آپ روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بات ابوہریرہؓ سے بیان کی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کو میری نسبت اس بات کا زیادہ علم ہے۔ میں نے یہ بات رسول اللہ صلعم سے خود نہیں سنی تھی بلکہ فضل ابن عباسؓ سے سنی تھی۔[1]

بعض صحابہؓ نے ان کے رسول اللہ صلعم سے اس کثرت کے ساتھ روایتیں نقل کرنے پر بہت زیادہ تنقید کی بلکہ ان کی روایات میں شک و شبہ کیا۔ چنانچہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "تم لوگ سمجھتے ہو کہ ابوہریرہؓ، رسول اللہ صلعم سے بہت زیادہ روایتیں نقل کرتا ہے ——— خدا ہی اس کا فیصلہ فرمائے گا ——— میں ایک مسکین آدمی تھا۔ میں پیٹ بھر روٹی کے عوض رسول اللہ صلعم کی خدمت کرتا رہتا تھا اور مہاجرین بازاروں میں سودے کرتے رہتے تھے۔ انصار اپنے کھیتوں اور باغات میں مصروف رہتے تھے"۔ مسلم ہی میں ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے ——— اس کا فیصلہ خدا ہی کرے گا ——— وہ کہتے ہیں کہ مہاجرین و انصار ان کی طرح اس کثرت سے کیوں حدیثیں بیان نہیں کرتے ——— میں تمھیں اس کے متعلق بتاتا ہوں ——— میرے انصاری بھائی اپنی زمینوں کے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور میرے مہاجر بھائی بازاروں میں سودے کرتے رہتے تھے۔ میں ہر وقت رسول اللہ صلعم کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ مجھے پیٹ بھر کر روٹی مل جانے سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ جب یہ لوگ غائب ہوتے تھے میں اس وقت بھی حاضر رہتا تھا۔ جب یہ لوگ بھول جاتے تھے تو میں اس وقت یاد رکھتا تھا۔

فقہائے حنفیہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو جبکہ وہ خلاف قیاس ہو بعض اوقات چھوڑ دیتے ہیں جیسا کہ مصراۃ کی حدیث میں انھوں نے کیا ہے۔[2] ابوہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ "اونٹنیوں اور بکریوں کے تھن، دودھ نہ دوہ کر بڑے بڑے نہ بناؤ۔ ایسا کرنے کے بعد اگر کوئی شخص ایسے جانور کو خریدے تو اسے دودھ دوہ کر دیکھ لینے کے بعد دونوں باتوں کا اختیار ہے۔ اگر اس کا جی چاہے تو اسے رکھ لے اور اگر ناپسند ہو تو اسے واپس کر دے مگر واپس کرتے ہوئے مالک کو ایک صاع کھجوریں دیدے"۔ اس پر فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ ابوہریرہؓ فقیہہ نہیں ہیں یہ حدیث تمام قیاسوں کے خلاف ہے کیونکہ دودھ دوہنا ایک تعدی زیادتی ہے اور تعدی کا تاوان بالمثل ہو سکتا ہے یا قیمت کی صورت میں۔ کھجوروں کا ایک صاع ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔" حدیثیں گھڑنے والوں کو ابوہریرہؓ کی کثرت روایت سے ایک موقعہ ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے بے شمار حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان کے سر تھوپ دیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلعم کی محبوب ترین اہلیہ محترمہ تھیں۔ ہجرت سے چھ یا سات مہینے بعد

---

[1] مسلم الثبوت و شرح مسلم الثبوت صفحہ ۵۰۔ [2] مصراۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کو فروخت کرنے کا ارادہ ہو اس لئے اس کا دودھ کئی دن تک نہ دوہا جائے بلکہ اس کے تھنوں میں جمع رکھا جائے تاکہ خریدار یہ سمجھے کہ یہ اونٹنی بہت دودھ دینے والی ہوگی۔

ان کی رخصتی ہوئی اور مدینہ منورہ کی پوری مدت آپ کے ساتھ رہیں۔ حضور اکرم صلعم کی وفات ہوئی تو ان کی عمر اٹھارہ سال تھی[1]۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ نے سیاسی زندگی میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ پر تنقیدیں کیں اور حضرت علیؓ سے جنگ لڑی۔ جیسا کہ ان کی سیرت کے مطالعہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ غضب کی ذکاوت و ذہانت پائی تھی۔ پڑھنا سیکھا اور ادب جاہلی پر بھی ان کو بڑا عبور حاصل تھا۔ صحابہؓ میں ان کا بڑا اونچا مقام تھا۔ صحابہؓ ان سے دینی اور قضائی مسائل میں مشورے لے لیا کرتے تھے ـــ ان کی نظری ذکاوت اور رسول اللہ صلعم کے ساتھ طویل اختلاط نے انھیں یہ قدرت عطا کردی تھی کہ وہ رسول اللہ صلعم سے بکثرت روایات نقل کریں خصوصیت سے ان معاملات کے متعلق جو گھریلو حالات سے تعلق رکھتی تھیں جن پر اطلاع پانا دیگر صحابہؓ کے لئے آسان نہیں تھا۔ آپ کا انتقال ۵۸ھ میں ہوا۔

اگر ہم باقی صحابہؓ کے حالات زندگی بھی لکھیں تو بات لمبی ہوجائے گی۔ ان کے بعض حالات تو حیات عقلیہ کے مرکزوں پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے بھی آچکے ہیں۔

صحابہ کے بعض شاگرد تھے جو ان کے ساتھ خصوصیت رکھتے اور انہی کی روایات بیان کرتے تھے۔ زمانے گزر جانے کے بعد محدثین کے ایسے کچھ سلسلے بن گئے جن میں سے کچھ سلسلوں کو علمائے حدیث نے دوسرے سلسلوں پر فضیلت دی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا صحیح ترین سلسلۂ سند "اسماعیل بن ابی خالد عن قیس ابن ابی حازم عن ابی بکرؓ" مانا جاتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کا صحیح ترین سلسلۂ سند "زہری عن سالم عن ابیہ عن جدہ" ـــ سالم کے دادا حضرت عمرؓ ہی ہیں ـــ مانا جاتا ہے ـــ ابوہریرہؓ کا صحیح ترین سلسلۂ سند "زہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرہؓ" مانا جاتا ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کا صحیح ترین سلسلۂ سند "عبید اللہ بن عمر عن القاسم عن عائشہ" مانا جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے صحابہ کے سلسلوں کا ہے۔

پہلی صدی ہجری ساری کی ساری گذر گئی اور کسی خلیفہ نے حدیث کے لئے کوئی باقاعدہ کام نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ صحابہؓ یا کبار تابعین کی کسی بڑی جماعت کے یہ کام سپرد کر دیتے کہ

پہلی صدی ہجری میں تدوینِ حدیث کا کام نہیں ہوا

جو کچھ حدیثیں لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں ان کا تیقن حاصل کرلیں اور جتنی حدیثیں ان کے نزدیک صحیح قرار پائیں انھیں کسی ایک کتاب میں جمع کرلیں اور اس کے نسخے تمام شہروں میں بھیجدیں جیسا کہ قرآن کے بارہ میں کر چکے تھے۔ اور پھر لوگوں کو منع کردیں کہ اس کتاب کے علاوہ کوئی شخص کسی قسم کی کوئی حدیث بیان نہ کرے۔ شاید کسی خلیفہ کے دل میں یہ بات آئی بھی ہو لیکن اس نے دیکھا ہو کہ ایسا کرنا انتہائی دشوار ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی تو ان صحابہؓ کی تعداد جنھوں نے حضورؐ سے کچھ سنا تھا اور جسے وہ بیان کرتے تھے ۱۱۴۰۰۰ تھی۔ ہر صحابی کے

---

[1] یہ بات غلط ہے۔ آپؐ کی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم از کم اٹھائیس سال تھی۔

جمع حدیث کی دشواریاں

پاس ایک دو یا زیادہ حدیثیں موجود تھیں۔ رسول اللہؐ نے کچھ باتیں کچھ لوگوں کے سامنے فرمائی تھیں جو دوسروں کے سامنے نہیں فرمائی تھیں۔ کچھ واقعات کچھ لوگوں کے سامنے پیش آئے تھے جو دوسروں کے سامنے پیش نہیں آئے تھے۔ اور یہ تمام صحابہ مختلف شہروں میں پھیل چکے تھے۔ لہٰذا حدیث کو جمع کرنے کے معنی یہ تھے کہ ان سب سے کہا جاتا کہ جس کے پاس جو حدیث ہے وہ اسے پیش کرے۔ ان سب کی حدیثیں سنی جاتیں اور پھر ان کو جمع کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پھر اگر ایسا کیا بھی جاتا تو صحابی اپنی سنی اور دیکھی ہوئی ساری باتیں بیان کس طرح کر سکتے تھے۔ ان کے پاس یہ حدیثیں لکھی ہوئی تو تھیں نہیں۔ وہ صرف اپنے حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔ اور یہ باتیں موقعہ موقعہ کی مناسبت ہی سے یاد آتی تھیں۔ بہرحال یہ سب دشواریاں تھیں جنہوں نے اس کو ناممکن سا بنا دیا تھا۔ تاہم اب نظر آتا ہے کہ آگے چل کر حدیث میں جو بدنظمی پیدا ہوئی اگر بڑے بڑے صحابہؓ کی جانی پہچانی حدیثیں جمع کر لینے پر اکتفا کر لیا جاتا اور لوگوں کو ان کے سوا حدیثیں بیان کرنے سے روک دیا جاتا تو مسلمانوں کے لئے بہتر ہوتا۔ (اور وہ بدنظمی پیدا نہ ہوتی۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے حضرت عمرؓ کو آیا تھا۔ چنانچہ زہری سے بیان کیا جاتا ہے کہ

تدوین حدیث کا خیال

مجھے عروہ بن الزبیر نے بتایا کہ عمر ابن الخطابؓ نے سنن کو لکھوانے کا ارادہ کیا تھا اور صحابہؓ سے اس بارہ میں مشورہ بھی کیا تھا۔ عام صحابہؓ نے انہیں ایسا کر لینے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ ایک ماہ تک اس بارہ میں خدا سے استخارہ کرتے رہے اور ان کا دل کسی ایک جانب نہیں جھکا۔ پھر ایک دن صبح کو وہ اٹھے تو خدا نے ان کا دل ایک طرف جھکا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے تم سے جیسا کہ تمہیں معلوم ہے سنن کو لکھ لینے کے بارہ میں کہا تھا۔ اس کے بعد میں نے غور کیا تو تم سے پہلے کچھ لوگوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ کچھ دوسری کتابیں بھی لکھی تھیں۔ وہ ان کتابوں پر ہی جھک کر رہ گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھے۔ ہٰذا خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور چیز نہیں ملاؤں گا۔"

اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ خیال آیا۔ موطا میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر ابن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہؐ کی حدیثوں اور سنتوں کو تلاش کر کے لکھ لو۔ مجھے ڈر ہے کہ علماء کے جانے کے ساتھ ساتھ علم ہی نہ مٹ جائے۔ ابونعیم نے تاریخ اصبہان میں بیان کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام شہروں میں لکھ دیا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی حدیثیں تلاش کر کے جمع کر لو۔

لیکن ہمیں اس حکم کا کوئی عملی نشان نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم دینے کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا ہو یا بعد میں آنے والے لوگوں نے ان کے اس حکم کی کوئی پرواہ نہ کی ہو۔ جب ابوجعفر منصور کا زمانہ آیا تو اسے یہ خیال پھر آیا۔ ابن سعد نے طبقات میں امام مالک بن انسؒ سے نقل کیا ہے کہ جب منصور نے حج کیا تو مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری ان کتابوں کے متعلق جو تم نے مدون کی ہیں حکم دیدوں کہ ان کی بہت سی نقلیں تیار کر لی جائیں پھر میں مسلمانوں کے ہر شہر میں ان کا ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور انہیں حکم دیدوں کہ جو کچھ ان کتابوں میں ہے اس کے مطابق عمل کریں اور اس سے آگے نہ بڑھیں۔ تو میں نے کہا

کہا کہ اسے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ لوگوں کے پاس اس سے پہلے بہت سی باتیں پہنچ چکی ہیں وہ بہت سی حدیثیں سن چکے ہیں اور بہت سی روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ہر شہر کے لوگوں کے پاس جو باتیں پہلے پہنچ گئیں انہی کو انہوں نے اختیار کر لیا اور ان کے مطابق وہ ڈھل گئے ہیں۔ لہذا اب ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے کہ جس طرح ہر شہر والے عمل کرتے آرہے ہیں عمل کرتے رہیں۔" بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصور کی نیت صرف یہی نہیں تھی کہ کسی ایک کتاب میں حدیثیں جمع کر لی جائیں اور لوگوں کو انہیں قبول کرنے پر آمادہ کر کے باقی حدیثیں چھوڑ دینے کے لئے کہا جائے۔ بلکہ منصور کا مقصد یہ تھا کہ امام مالک کی کتابوں کو ایک عام اسلامی قانون کی بنیاد بنا دیا جائے جس کے مطابق تمام مملکت اسلامیہ میں فیصلے کئے جائیں اور انہیں ایک باضابطہ قانون کی شکل دے دی جائے جس میں زمانہ بزمانہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ مضمون وضاحت کے ساتھ اس روایت میں ملتا ہے جو حلیہ میں امام مالک سے نقل کی گئی ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ کیا کہ کعبہ میں مؤطا کو لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو اس کے مشمولات پر راغب کیا جائے تو میں نے عرض کیا کہ ایسا نہ کیجئے کیونکہ رسول اللہ صلعم کے اصحاب میں فروعی مسائل میں اختلاف ہے اور وہ مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے سب کے سب راہِ صواب پر تھے۔

بہرحال پہلی صدی ہجری گذر گئی اور تدوینِ حدیث کے سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا۔ لوگ زبانی اپنے حافظے سے روایتیں نقل کرتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی کچھ لکھتا بھی تھا تو وہ محض اپنی یادداشت کے لئے لکھ لیتا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں مختلف شہروں میں ایسی جماعتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں جنہوں نے حدیثیں جمع کرنی شروع کیں۔ مگر ان کا حدیثیں جمع کرنا اس معنے میں نہیں تھا جس کا ہم نے پہلے بیان کیا ہے بلکہ اس معنے میں تھا کہ ہر عالم ان روایتوں کو جمع کر لیتا تھا جو اس تک پہنچی تھیں اور اس کے خیال میں صحیح ہوتی تھیں۔ ابن حجر نے شرح بخاری میں کہا ہے کہ "سب سے پہلے جن نے حدیثیں

دوسری صدی ہجری میں جمع حدیث کا آغاز

جمع کیں وہ ربیع ابن صبیح (متوفی ١٦٠ھ) اور سعید بن ابی عروبہ (متوفی ١٥٦ھ) تھے۔ یہاں تک کہ معاملہ تیسرے طبقے کے بڑے علماء تک پہنچا اور مدینہ منورہ میں امام مالک نے مؤطا تصنیف کی، عبدالملک بن جریج نے مکہ میں، اوزاعی نے شام میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں اور حماد بن سلمہ بن دینار نے بصرہ میں اپنی اپنی کتابیں مدون کیں۔ ان کے بعد مختلف ائمہ نے اپنی اپنی صوابدید اور اپنے اپنے علم کے مطابق کتابیں تصنیف کرنی شروع کر دیں۔" ان میں سے کچھ کتابیں تو ابواب فقہیہ کی ترتیب کے مطابق مرتب کی گئیں جیسے مؤطا بخاری، مسلم۔ بعض کتابیں راویوں کی ترتیب کے مطابق مرتب کی گئیں۔ مثلاً ابوہریرہ کی مرویات ایک جگہ جمع کر دی گئیں اور اسی طرح باقی صحابہؓ کی حدیثیں۔ جیسے مسند امام احمد۔ ہم یہاں ان کتابوں کے متعلق کچھ بیان نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ ساری کتابیں اس زمانہ (بنو امیہ) کے بعد تصنیف ہوئی ہیں جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں۔

[illegible]

اس کے بعد اتنا اور سمجھ لیجئے کہ حدیثوں نے ـــــ خواہ وہ صحیح ہوں یا موضوع ـــــ عالم اسلامی میں ایک خاص تہذیب کو

ایک خاص تہذیب کو پھیلانے میں احادیث کا کارنامہ

پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ لوگ پوری توجہ کے ساتھ ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ اور مختلف شہروں کی علمی حرکات قریب قریب اسی محور پر گھومنے لگیں۔ تمام علمائے صحابہ و تابعین کی شہرت تفسیر اور حدیث کی بنیاد پر قائم تھی — حدیث کا دائرہ زیادہ وسیع تھا — لوگوں کو چونکہ روایت حدیث کا بڑا شوق تھا اس لئے علمار مملکت کے دور دراز حصوں تک سفر کر کے جاتے اور مختلف شہروں میں گھوم پھر کر ایک دوسرے سے حدیثیں حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح آراء و افکار کا تبادلہ بھی ہوتا تھا اور ہر شہر والوں کو دوسرے شہر والوں کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ ان کے پاس کون کون سی حدیثیں ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی علمی حرکت میں قریب قریب وحدت سی پیدا ہونے لگی۔ امام احمدؒ نے بیان کیا ہے کہ جابر بن عبد اللہ انصاری رضؓ کو معلوم ہوا کہ عبد اللہ ابن انیس جہنیؓ کے پاس ایک حدیث ہے جسے انھوں نے رسول اللہ صلعم سے سنا تھا۔ انھوں نے ایک اونٹ خریدا اور زادِ سفر باندھ کر ایک مہینہ کا لمبا سفر کر کے شام میں ان کے پاس پہنچے اور وہ حدیث ان سے سنی[1]۔ آپ کسی محدث کے حالاتِ زندگی پڑھ جائیے ان کے حالاتِ زندگی کا بڑا حصہ اسی قسم کے علمی اسفار پر مشتمل ہوگا اس پر اس خط و کتابت اور مراسلت کا اور اضافہ کر لیجئے جو ان حضرات کے مابین ہوتی رہتی تھیں۔ مالک بن انسؒ مدینہ منورہ میں تھے اور لیث ابن سعدؒ مصر میں۔ ان میں برابر خط و کتابت کا سلسلہ رہتا۔ امام مالکؒ ان کو خط لکھتے اور وہ امام مالکؒ کو جواب دیتے تھے۔ اس طرح یہ دونوں حضرات حدیث اور فقہ میں دلائل اور براہین کا تبادلہ کرتے تھے۔

حدیث کی اس راہ سے عالمِ اسلامی میں تہذیب و ثقافت کی متعدد انواع کو فروغ ہوا۔ اسلامی تاریخ حدیث ہی کی شکل میں شروع ہوئی جس میں مغازی، فضائلِ اشخاص اور فضائلِ اقوام سب کچھ شامل تھا۔ اس کے بعد تاریخ مختلف مدارج سے گذر کر ایک مستقل فن کی حیثیت سے الگ کتابوں میں روشناس ہوئی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابتدائی تاریخی کتابیں مثلاً سیرت ابن ہشام، نیز ابن اسحاق سے ابن جریر کی روایات۔ فتوح البلدان میں بلاذری کا اندازِ بیان قریب قریب وہی ہے جو حدیث کا انداز و اسلوب تھا۔ انبیاء کے قصے اور واقعات جو قرآن میں آئے ہیں، حدیث میں جا کر انھوں نے بڑی وسعت اختیار کر لی۔ پھر قصہ گو واعظوں نے اسے اور بھی وسعت دی تو قصے، کہانیاں، حکمت کی باتیں، اخلاق کی بنیادی چیزیں کچھ یونانی، ہندی اور ایرانی فلسفہ کی باتیں حدیث میں شامل کر دی گئیں اور وہ لوگوں میں دین کا جامہ پہن کر پھیل گئیں۔ چنانچہ ان کے اثرات عام لوگوں پر وہ نہیں ہوئے جو نبوی تعلیمات کے ہونے چاہئیں تھے۔ مزید برآں حدیث، عبادات، مدنی مسائل اور تعزیراتی قوانین وغیرہ کے لئے وسیع ترین سرچشمہ تھا جس کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔

مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ اس بنو امیہ کے عہد میں، حدیث علم و ثقافت کا وسیع ترین سرچشمہ تھا۔

---

[1] قسطلانی ص ۲۰، ج ۱

ان کتابوں کی فہرست جن سے اس فصل کی تدوین میں مدد لی گئی

فتح الباری شرح بخاری	المعارف لابن قتیبہ
قسطلانی شرح بخاری	میزان الاعتدال للذہبی
مسلم ۔ شرح نووی بر مسلم	طبقات ابن سعد
تیسیر الوصول الی جامع الاصول	مقدمہ ابن خلدون
المستصفیٰ ، للغزالی	الملل والنحل لابن حزم
شرح مسلم الثبوت	مسند امام احمد بن حنبل
الموافقات للشاطبی	دائرۃ المعارف الاسلامیہ مادہ "حدیث"
اسد الغابہ لابن الاثیر	شرح ابن ابی الحدید علی نہج البلاغت
الاصابہ لابن حجر	جامع بیان العلم وفضلہ للقرطبی

اسلامی معاشرت

(تیسرا ایڈیشن)

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات۔ بالخصوص عورتوں۔ بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

قیمت: دو روپے

ملنے کا پتہ:-

ناشر ادارہ طلوع اسلام

۲۵-بی ــ گلبرگ کالونی ــ لاہور

حقائق و عِبَر

۱۔ یہ وہی قائدِ اعظمؒ ہیں

جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفت روزہ ایشیا (لاہور)، نے (جس کے مدیر ملک نصراللہ خان عزیز ہیں) اپنی ۳۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں (غالباً قائدِ اعظم مرحوم کی یومِ پیدائش کی تقریب پر) آمنے سامنے کے دو صفحات پر یہ عنوان ثبت کیا ہے۔

پاکستان کا نظریہ و نصب العین کیا تھا؟

تحریک پاکستان کے رہنما جناب محمد علی جناح سے معلوم کیجئے۔

قائدِ اعظم کے چند تاریخی ارشادات۔

اس عنوان کے نیچے الگ الگ چوکھٹوں میں، قائدِ اعظمؒ کے مختلف مواقع پر ارشادات کے اقتباسات دیئے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

(۱) ہمارا مذہب، ہماری تہذیب، اور ہمارے تصورات ہی وہ محرک قوتیں ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھاتی ہیں۔

(۲) اگر ہم قرآنِ مقدس سے تحریک اور ہدایت حاصل کریں تو میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخری فتح ہماری ہوگی۔

(۳) اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ پاکستان اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ساری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہے ۔۔۔۔ پاکستان ایک تحریک کا نام ہے جس کا مقصد پاکستان کے مرکز سے اسلامی نظریۂ حیات کا فروغ و اشاعت ہے۔

(۴) ہمارے ملک میں اس وقت دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک طبقہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کا حامی ہے اور دوسرا طبقہ پاکستان میں روایتی اسلام کا نظام برپا کرنا چاہتا ہے۔ میں ذاتی طور پر صحیح اسلامی نظام کا دیانتداری سے خواہشمند ہوں۔ پاکستان کے علاقوں میں ہم اس قابل ہوں گے کہ اسلام کے شرکے اور اپنے تہذیب و تمدن کی نگہبانی دوسروں کی مداخلت کے

بخیر کر سکیں۔

(۶) مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق اور خود اپنے تہذیبی ارتقاء، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔

(۷) کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ ہمارا مدعا پوری طرح نہیں سمجھتے جب ہم اسلام کا ذکر کرتے ہیں۔ اسلام محض چند عقیدوں روایتوں اور روحانی تصورات کا مجموعہ نہیں۔ اسلام ہر مسلمان کے لئے ایک ضابطہ بھی ہے جو اس کی زندگی اور کردار کو سیاست اور معیشت تک کے معاملات میں انضباط دیتا ہے۔

(۸) اسلامی اصولوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آج بھی یہ اصول زندگی میں اسی طرح قابلِ نفاذ ہیں جیسے کہ یہ تیرہ سو سال پہلے تھے۔

(۹) تیرہ صدیاں گزر جانے پر بھی اچھے اور برے احوال و ظروف کے باوجود جن سے مسلمان گذرے ہیں ہم لوگ اپنی عظیم اور مقدس کتاب پر نازاں ہی نہیں رہے ہیں بلکہ ان تمام زمانوں میں اس کے جملہ اصولوں کے ساتھ ہمارا تعلق برقرار رہا ہے۔

(۱۰) میں اپنے ملک میں صحیح اسلامی جمہوری اصول و اقتدار کا احیاء اور اقتدار چاہتا ہوں۔

(۱۱) بعض لوگ نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ یہ لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ میں اسلام سے ناواقف ہوں۔ میں نے قرآن کریم کو بار بار بغور پڑھا ہے اور جب میں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان جب اسلامی نظام قائم ہوگا تو یہ محض اعلا اور بڑ نہیں تھی۔

یہ تھا پاکستان کا وہ نصب العین جس کی قائداعظم علیہ الرحمۃ (جماعت اسلامی کے ترجمان کی شہادات اور ملک نصراللہ خان عزیزؒ کے اعتراف کے مطابق) اس طرح وضاحت فرماتے رہتے تھے۔ لیکن جس زمانے میں قائداعظمؒ اس پاکستان کے حصول کے لئے مصروفِ جدوجہد تھے، اسی جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تحریک پاکستان اور اس کے قائد کے متعلق اس قسم کے ارشادات ارزاں فرمانے میں مشغول تھے۔ مثلاً

> اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کے برعکس ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر، ان کو مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باقی رہا نظام حکومت تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلم کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں بلکہ

اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت سبب تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صف آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم حکومت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت کو دینی کی کوشش کریں گے .... ان لوگوں کا یہ گمان غلط ہے۔ (حصولِ پاکستان سے) جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان القرآن۔ جلد ۱۸ عدد ۱ صفحہ ۲۲-۲۳)

جب ان سے کہا جاتا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے کے بجائے اس سے تعاون کریں تو وہ کہتے کہ

(نادان ہے وہ شخص) جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گی۔ (ایضاً صفحہ ۳۰)

تحریکِ پاکستان کی آواز بلند کرنے والے طبقہ (یعنی قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقاء) کے متعلق مودودی صاحب فرمایا کرتے تھے۔

یہ گروہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے.... ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں ان کی نمائندہ مجلسوں کی قراردادیں۔ ان کے کارکنوں کی باتیں۔ ان کے اہلِ قلم کی تحریریں۔ سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے۔ یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

دوسرے مقام پر ہے۔

ان کے خیالات۔ نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی جھلک نہیں دیکھی جا سکتی ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انھیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں انھیں نور ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر میں ملتا ہے۔

(سیاسی کشمکش۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷ عدد ۲ صفحہ ۲۹)

انھوں نے ترجمان القرآن بابت مئی۔ جون ۱۹۴۵ء میں لکھا تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات۔ مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیانِ شرع متین ...... مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی۔ (صفحہ ۱۶۹)

یہ تھے قائدِ اعظمؒ اور ان کی تحریک کے متعلق امیر جماعتِ اسلامی کے خیالات جن کی نشر و اشاعت میں وہ مسلسل دس سال تک پورا زورِ قلم صرف فرماتے رہے۔ نہ صرف حصولِ پاکستان سے پہلے، بلکہ اس کے بعد بھی جب کبھی انھیں موقع ملا اسی قسم کی زہر افشانی فرمائی۔ مثلاً وہ "جماعتِ اسلامی

اس کا مقصد ـ تاریخ اور لائحہ عمل ۔ نومبر ۱۹۴۱ء میں فرماتے ہیں۔

دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ۔ ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گذرے ہو گئے ...... بدترین سیرت واخلاق کے لوگ صحافت و قیادت پر قابض ہو گئے۔

(مولانا مودودی کی تحریک اسلامی صفحہ ۲۳ -- ۱۹۲)

یہ تھی امیر جماعت اسلامی کے نزدیک) اس قیادت کی سیرت واخلاق کی حالت جس کی مرکزی شخصیت قائد اعظم تھے۔ وہی قائد اعظم جن کے افکار و تصورات کو اب (ایشیا کے صفحات پر اس انداز سے پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تو رہا اس جماعت کے امیر کا معاملہ جن کا ترجمان ایشیا ہے۔ اس باب میں خود ایشیا کے مدیر ملک نصراللہ خان صاحب عزیز ان سے بھی دس قدم آگے تھے۔ وہ اسی قائد اعظم کو اپنے طنز و استہزاء کا ہدف بنایا کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے مثلاً ان کے اخبار کوثر کی ۱۳ / جنوری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں آپ کو حسب ذیل "تیر و نشتر" دکھائی دیں گے۔ لکھا ہے

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

ان زمانہ میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انھوں نے اپنی زمین لپیٹی سے اٹھا کر آسمان رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔

اب ان کے اخبار خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا "ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"۔

بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ مہدی علیہ السلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدہ خیال میں نکل رہا تھا آخر کار نتیجہ خیز ہوا۔ اور مسٹر جناح نے رہبری درخواست قیادت قوم کے حضور میں گذران دی۔ قوم نے باقی سب امیدواران قیادت کو برخاست کر دیا۔ اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا اور "قائد اعظم" زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ قائد اعظم نے بھی اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ مہدی علیہ السلام نہ سہی مگر ماوی مو مہتے ہٹلر و مسولینی کی طرح تو وہ قوم کی خدمت کر ہی سکتے ہیں۔

ہم اس مرحلے پر پہنچ کر یہ سمجھے تھے کہ قوم نے اپنا رہنما پا لیا ہے اور اب تلاش مزید کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگلے روز لاہور کے ایک مسلمان معاصر میں ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ضرورت تو اب بھی باقی ہے۔ اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ جب نواکھلی میں فساد ہوا اور بہار میں بھی تباہی مچی تو مشرقی بنگال کے ہندوؤں کی داد رسی کرنے، ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا انتظام کرنے اور ان کے اجڑے ہوئے گھروں کو آباد کرنے کے لئے گاندھی جی نے جان کی بازی لگا دی۔ اور اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر بہار کے تباہ حال مسلمانوں کی دست گیری کے لئے مسٹر جناح دہلی سے مشرق کی طرف جانے کی بجائے اُلٹا دور مغرب کو چلے گئے۔ اور کراچی میں بیٹھ کر رہ گئے۔ (بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر صفحہ ۳۶ — ۳۷)

اس وقت قائدِ اعظمؒ یہ تھے۔ اور اب وہی قائدِ اعظمؒ، انہی ملک نصراللہ خاں عزیز کے نزدیک وہ ہیں جن کا عکس ایشیا کے صفحات پر مرتسم کیا گیا ہے۔ ہمیں ان حضرات کے زاویۂ نگاہ کی اس تبدیلی پر خوشی ہوئی۔ فوجی انقلاب کے بھی ملک پر کتنے بڑے بڑے احسان ہیں!

۲— پالیش یا باہم بازی

عبدالماجد دریابادی صاحب کے اخبار صدق جدید (لکھنؤ) کی ۱۹ دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر "سچی باتیں" کے عنوان کے تحت حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

حال کے ایک مذہبی مقالے سے:۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے سامنے ایک ایسے شخص کا معاملہ پیش کیا گیا۔ جو کہتا تھا کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا۔ شاگردوں نے بے تکلف فتویٰ دیدیا کہ یہ شخص کافر ہوگیا، کیونکہ یہ قرآن کو جھٹلا رہا ہے۔ مگر امام صاحب نے فرمایا کہ تکفیر میں جلدی نہ کرو۔ کیا اس کے قول کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی؟ شاگردوں نے عرض کیا کہ ایسے صریح قول کی کیا تاویل ہوسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کی ایک تاویل ممکن ہے۔ شاید اس کا خیال یہ ہو کہ جب انسان حشر میں اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لے گا تو وہ کافر نہ رہے گا۔ بلکہ مومن ہو جائے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت کا ایمان اسے دوزخ سے نہ بچائے گا۔ مگر اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ دوزخ میں جانے سے پہلے وہ خدا کی الوہیت مان چکا ہوگا۔ اس بنا پر جو شخص کہتا ہے، کہ کوئی کافر دوزخ میں نہیں جائے گا اس کی مراد اس سے ہوسکتی ہے کہ بحالتِ کفر کوئی شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ یہ ایک حق بات ہے۔ پھر اس کے کہنے والے کو تم کافر کیسے کہہ سکتے ہو؟"

فرمایئے کہ آج اپنی حنفیت پر زیادہ سے زیادہ ناز کرنے والے بھی کوئی عالم صاحب مسلک کے اس توسع کے روادار ہوسکتے ہیں؟ دیوبند جو ہندوستان میں حنفیت کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ وہ بھی رحماء بینھم کی تفسیر میں اس حد تک آگے جاسکتا ہے؟ وسعتِ مسلک اور حسنِ ظن کی اس تعلیم پر کہیں عمل ہو گیا ہوتا۔ تو تاریخِ تکفیر میں اتنی ضخامت کہاں سے ہو پاتی!

اب دوسرے پہلو کو لیجئے۔ اس حد تک توجیہہ و تعلیل ایک کھلے ہوئے قول منکر کی ایک امتٔ والے اور رحم دل بندے نے کر ڈالی ہے جس پر دوسرے اہل علم و فضل دنگ رہ گئے۔ اب تصور میں ذرا میدان حشر کو لایئے۔ جہاں ایک طرف ہم جیسے بڑے بڑے بیہودہ گو اور گنہگار بندے ہوں گے۔ اور دوسری طرف وہ رحمتِ سبقت علی غضبی (میرا رحم و کرم میرے جلال سے کہیں بڑھا ہوا ہے) کہنے والا ارحم الراحمین ہوگا۔ مغفرت و بخشش پر تلا ہوا۔ ہر بندہ سے کہیں بڑھ کر علیم و خبیر بھی اور کہیں بڑھ کر رحیم و شفیق بھی۔ کیسی کیسی تاویلیں اور معذرتیں اپنے بندوں کی طرف سے پیش کر دے گا۔ جن کا آج تصور بھی بشری دماغ میں نہیں آسکتا!—— ان پر تکیہ کر کے آج غفلتوں میں پڑے رہنا

اور اپنے اصلاحِ حال کی فکر نہ کرنا ہرگز روا نہیں۔ اور ایک انتہائی نادانی ہے۔ پھر بھی اس دن کا منظر دیکھنے کے قابل ہو گا۔ جب کیسے کیسے مجرموں اور مایوسیوں کا شکار اپنے کو اعلیٰ درجہ کے خوش نصیبوں کے زمرے میں داخل اور شامل پائیں گے۔

اس بات کو تو سر دست چھوڑ دیجئے کہ جس واقعہ کو امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ اس شذرہ کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے اور سوچئے کہ ان حضرات کے نزدیک خدا کا تصور کیا ہے؟ یہ کہ ایک طرف تو وہ میدانِ حشر میں میزانِ عدل نصب کرے گا کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ (جزا اور سزا) ملے اور دوسری طرف وہ خود ہی مجرموں کی طرف سے ایسی ایسی تاویلیں اور معذرتیں تراش تراش کر پیش کرے گا جن کا تصور تک بھی ان مجرموں کے ذہن میں نہ ہو۔ پھر وہ اپنی طرف سے پیش کردہ تاویلوں اور معذرتوں کو خود ہی قبول کرے گا اور مجرموں کو بخش دے گا!

اگر اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مجرموں کو بخشنے کے لئے خدا کو اس قسم کے حیلے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ ان تکلفات کے بغیر مجرموں کو سیدھا جنت میں کیوں نہیں بھیج دے گا؟ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے بگلا پکڑنے والی کہانی نہیں سنی۔ کہانی یہ ہے کہ کسی نے لال بجھکڑ سے پوچھا کہ بگلا کیسے پکڑا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ جب بگلا اطمینان سے دھوپ میں بیٹھا ہو تو دبے پاؤں جا کر اس کے سر پر موم رکھ آؤ اور پھر خاموشی سے انتظار کرو۔ جب موم دھوپ سے پگھل کر اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لے گی تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ اس وقت جا کر بگلے کو پکڑ لو۔ اس نے کہا کہ جب بگلے کے سر پر موم رکھنے کے لئے جائیں تو اسے اسی وقت کیوں نہ پکڑ لیں؟ لال بجھکڑ صاحب نے فرمایا کہ اس میں استادی کیا ہوئی!

معاذ اللہ۔ اس قسم کا ان حضرات کے نزدیک خدا کا تصور ہے۔ اور یہ کچھ اس خدا کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا ارشاد ہے کہ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ۔ اس دن انسان کو اس کی خبر دی جائے گی جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ۔ اس دن انسان اپنی ذات کے خلاف خود ہی دلیل اور شہادت ہو گا۔ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۷۵/۱۳-۱۵) خواہ وہ (اپنی مدافعت میں) کتنی ہی معذرتیں اور تاویلیں کیوں نہ پیش کرے!

ویسا بادی صاحب کو جب اس ضمن میں اس بات کا خیال آیا کہ خدا کے اس قسم کے تصور سے جرائم پیشہ لوگوں کی ہمت افزائی ہو جاتی ہے تو انہوں نے یہ فقرہ بڑھا دیا کہ

ان پر تکیہ کر کے آج غفلتوں میں پڑے رہنا اور اپنے اصلاحِ حال کی فکر نہ کرنا ہرگز روا نہیں۔ اور ایک انتہائی نادانی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب خدا کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مغفرت اور بخشش پر تلا رہتا ہے؟ اور مجرموں کی طرف سے ایسی ایسی تاویلیں پیش کرتا ہے جن کا تصور تک ان کے دماغ میں نہیں آ سکتا، تو پھر خدا کی اس رحیمی اور کریمی پر کیوں نہ تکیہ کیا جائے؟ ان حالات میں تو اس پر تکیہ نہ کرنا نادانی ہے۔

آپ: ان لوگوں کو کون بتائے کہ آپ کی اس قسم کی مضحکہ انگیز باتوں سے آپ کے متعلق جو خیال پیدا ہوتا ہے اسے تو چھوڑیئے۔ اس سے جس قدر اسلام بدنام ہوتا ہے اس کے تصور سے ہر قلبِ حساس خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ ہم ان سے بتاکید درخواست کریں گے کہ خدا کے لئے اپنی حالت پر نہیں تو کم از کم اسلام کی حالت پر ہی رحم فرمایئے۔ شاعری کے لئے اور بہت سے موضوع ہیں۔ ان پر طبع آزمائی فرمایئے۔ خدا کو تو بخش دیجئے۔

ایک اور بزرگ کی سنئے

یہ تو ہوا خدا کے متعلق۔ اب انہی جیسے ایک اور بزرگ کے خیالات خدا کی کتاب (قرآن) کے متعلق ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بزرگ حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ آج کل پیرس میں مقیم ہیں اور "تبلیغِ اسلام" کے فریضہ کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ ان کا ایک مقالہ کراچی کے ہفتہ وار (انگریزی) اخبار الاسلام میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے جس کا عنوان ہے۔

اسلام کی اصلی تعلیم کس طرح محفوظ رکھی گئی۔

اخبار مذکور کی ۵ اردسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں قرآن کریم کے متعلق ان کی حسبِ ذیل تحقیق شائع ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> یہ معلوم ہے کہ نبی اکرمؐ بعض اوقات قرآن کی ان آیات کو منسوخ فرما دیتے تھے جو اس سے پہلے لوگوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ یہ کچھ حدبندی کی بنا پر کیا جاتا تھا۔ ایسے صحابہؓ بھی تھے جنہوں نے پہلی آیات کو یاد کر رکھا ہوتا لیکن انہیں بعد میں نازل شدہ آیات کا علم نہ ہوتا اس کی وجہ یہ تھی کہ یا تو وہ آیاتِ مابعد کے نزول سے پہلے انتقال فرما گئے تھے یا مدینہ سے باہر (کسی اور مقام میں) سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان صحابہؓ نے قرآن کے ایسے نسخے چھوڑے ہوں جو اگرچہ مستند تھے لیکن (OUTDATED) ہو چکے تھے ...... علاوہ ازیں عرب کے مختلف علاقوں کی بولی میں فرق تھا۔ نبی اکرمؐ نے ان علاقوں کے لوگوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ قرآن کو اپنے اپنے لہجے کے مطابق پڑھ لیا کریں۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں اس کی بھی اجازت دیدی تھی کہ وہ اگر قرآن میں کوئی ایسا لفظ دیکھیں جس کا انہیں علم نہ ہو تو وہ اس لفظ کو اپنی زبان کے ایسے لفظ سے بدل لیا کریں جسے وہ اچھی طرح جانتے ہوں۔

اس سے واضح ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے نزدیک قرآن کریم کی صورت یہ تھی کہ

(۱) پہلے کچھ آیات نازل ہوتیں۔ کچھ وقت تک وہ قرآن کے اندر موجود رہتیں۔ پھر دوسری آیات نازل ہو جاتیں جو پہلی آیات کو منسوخ کر دیتیں۔ پہلی آیات کو قرآن سے خارج کر دیا جاتا اور بعد میں نازل شدہ آیات کو ان کی جگہ قرآن میں شامل کر لیا جاتا۔ جن صحابہؓ کو آیاتِ مابعد کا علم نہ ہوتا وہ پہلی آیات ہی کو قرآن سمجھ کر پڑھتے (اور ان پر عمل) کرتے رہتے تھے۔

(۲) بعض صحابہؓ رسول اللہؐ کی اجازت سے قرآنی الفاظ میں ردو بدل بھی کر لیتے تھے۔ یعنی قرآن کے نامانوس الفاظ کو

اپنے ہاں کے عام فہم الفاظ سے بدل لیتے تھے۔ آپ غور فرمائیے کہ اس صورتِ حال کے بعد قرآن کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن لفظاً لفظاً نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا تھا اور حضورؐ نے اسے اسی شکل میں امت تک پہنچا دیا۔ لیکن اس کی جو شکل صاحبِ مضمون بیان فرماتے ہیں اس کی رو سے منظر یہ سامنے آتا ہے کہ خود رسول اللہؐ کی زندگی میں بعض صحابہ کے قرآن میں کوئی آیات ہوتی تھیں اور بعض میں کوئی اور۔ نیز ایک ہی آیت میں، بعض کے قرآن میں کوئی الفاظ ہوتے تھے اور بعض کے ہاں کوئی اور ــــــ یہ ہے قرآن کا وہ تصور جو ڈاکٹر صاحب یورپ میں بیٹھ کر اہلِ مغرب کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور جسے ہمارے ہاں کے بڑے بڑے فخر سے اپنے ہاں شائع کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اصلی پوزیشن کو نظروں سے گرانے اور اس کے متعلق دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے جو سازشیں ہوئی ہیں ان میں سب سے مؤثر اور گہری سازش وہ تھی جس کی رو سے یہ خیال عام کیا گیا کہ

(۱) نبی اکرمؐ قرآن کا کوئی مدون نسخہ امت کو دے کر نہیں گئے۔ اسے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد جمع کیا گیا۔ (خود ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بھی اپنے مقالہ میں ایسا ہی لکھا ہے)۔ اور

(۲) موجودہ قرآن میں کئی آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔

لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ منسوخ آیات کو قرآن سے نکال دیا جاتا تھا اور ان کی جگہ ناسخ آیات لے لیتی تھیں۔ اس طرح رسول اللہؐ کی زندگی میں قرآن کے متن میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ جن صحابہؓ کو ان تبدیلیوں کا علم نہیں ہوتا تھا وہ پرانے متن ہی کو اصل قرآن سمجھتے رہتے تھے۔

یہ ہے ہمارے ان محققین کے نزدیک اس قرآن کی پوزیشن جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی تھی اور جسے ہم دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اس کا لفظ لفظ منجانب اللہ ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے؟

معراجِ انسانیت

(یعنی سیرتِ نبی اکرمؐ قرآنی آئینہ میں)

صفحات ۸۳۲ ۔ بڑی تقطیع مجلد مع گرد پوش دبیز ــــــــ قیمت ۔ بیس روپے

پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ ۔ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۵۹ء

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے اجتماع کے فیصلہ کے مطابق، طلوعِ اسلام کی آیندہ کنونشن، اپریل ۱۹۵۹ء میں رمضان شریف کے بعد لاہور میں منعقد ہوگی۔ طلوعِ اسلام کی (قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی) تحریک جن ادوار سے گزر رہی ہے اور زمانے کے احوال و ظروف کے جو تقاضے ہیں، ان کے پیشِ نظر اس کنونشن کی اہمیت کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس مرتبہ کنونشن میں شریک ہونے والے احباب کی تعداد پر پابندی لگا دی جائے۔ یعنی ہر بزم اپنے جس قدر اراکین کنونشن میں شرکت کے لئے بھیجنا چاہے بھیج سکتی ہے۔

(۲) اکتوبر کے اجتماع میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ کنونشن میں شریک ہونے والے احباب، قیام و طعام کے اخراجات کے سلسلہ میں پندرہ روپے فی کس ادا کریں۔ چونکہ انتظامی دشواریوں کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ کنونشن سے ایک ماہ قبل یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ شرکا کی تعداد کیا ہوگی اس لئے بزموں سے درخواست ہے کہ وہ

کنونشن میں شریک ہونے والے اراکین بزم کی فہرست۔ مع مجموعی رقم (بحساب پندرہ روپے فی کس) ۱۵ مارچ سے پہلے راقم الحروف کے نام بھیج دیں۔ جن صاحب کا نام اور رقم اس تاریخ تک موصول نہیں ہوگی انہیں کنونشن میں شریک نہیں کیا جا سکے گا۔

(۳) جس مقام پر ابھی بزم طلوعِ اسلام قائم نہیں ہوئی، اگر وہاں کے کوئی صاحب کنونشن میں شریک ہونا چاہیں تو وہ اپنی درخواست قریب ترین بزم کو بھیج دیں۔ اگر انہیں اس کا علم نہ ہو کہ قریب ترین بزم کہاں ہے، تو وہ اس کی بابت راقم الحروف سے دریافت کر لیں۔ لیکن کسی صاحب کا اخراجات کی رقم ادا کر دینا اس کے لئے مستلزم نہیں ہوگا کہ انہیں کنونشن میں شرکت کی اجازت ہے۔ اجازت آپ کو ہوگی جس کے لئے باقاعدہ دعوت نامہ جاری کیا جائے گا۔

(۴) کنونشن کی پختہ تاریخوں کا اعلان آیندہ پرچہ میں کیا جائے گا۔

(۵) جن بزموں کی طرف سے (۲۰ جنوری تک) برتن وغیرہ خریدنے کے سلسلہ میں رقوم موصول ہو چکی ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) کراچی	۳۰۱/-	(۷) پشاور شہر	۵۰/-
(۲) پنڈ دادن خان	۱۰/-	(۸) لاہور	۳۰۰/-
(۳) چہار باغ	۱۰/-	(۹) سیالکوٹ شہر	۵۰/-
(۴) سید حسین	۱۰/-	(۱۰) پشاور چھاؤنی	۲۵/-
(۵) چک ۵۰۰ شمالی	۵۰/-	(۱۱) پنج گسی	۵/-
(۶) راولپنڈی	۱۰۰/-	(۱۲) ہنگو	۱۰/-

میزان: ۹۲۱/-/-

باقیماندہ بزموں سے درخواست ہے کہ وہ دس فروری تک اپنی موعودہ رقم بھیجدیں۔

(چوہدری) عبدالرحمٰن۔ (صدر کنونشن کمیٹی) ہنری جی ہاؤس۔ متصل پاکستان منٹ۔ شالامار ٹاؤن۔ لاہور

جہلم کا دورہ ڈاکٹر حنیف مرزا صاحب کی دعوت پر محترم پرویز صاحب مع رفقاء ۶ جنوری کو قریب ایک بجے جہلم پہنچے اور سیدھے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں تشریف لے گئے جہاں ان کی تقریر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اجتماع میں طلباء کے علاوہ شہر کے ارباب علم و فکر بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ "قرآن اور علوم سائنس" تقریر کا موضوع تھا جسے سامعین نے بڑی توجہ اور انہماک سے سنا۔ تقریر کے بعد سوالات پوچھے گئے۔ ان میں سے بیشتر سوالات طلباء کی طرف سے کئے گئے جس سے نظر آیا کہ ہمارے نوجوانوں کا یہ طبقہ ان موضوعات میں کس قدر دلچسپی لیتا ہے بشرطیکہ انھیں صحیح انداز سے پیش کیا جائے۔

سہ پہر کو، کیپٹن انعام الحق کی طرف سے، جہلم کلب میں عصرانہ کا انتظام تھا جس میں سول اور ملٹری کے افسران اور دیگر ذی علم حضرات کی خاصی تعداد مدعو تھی۔ اس غیر رسمی سے اجتماع میں متفرق عنوانات پر گفتگو رہی جن میں مرکزی حیثیت اس سوال کو تھی کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں؛ یہ محفل بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز تھی۔ اس قسم کے اجتماعات سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اب "مذہب" کا گرویدہ ہے جسے ملّائی توہم پرستیاں دین خداوندی کہہ کر پیش کرتی ہیں۔ ورنہ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی اصلی شکل میں پیش کیا جائے تو وہ دل کے پورے اطمینان سے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ یہ عنوانات بڑے امید افزا ہیں۔

شب کو بیلہ دریا، لائبریری کے ہال میں جلسۂ عام تھا جس میں شہر اور چھاؤنی کا قریب قریب سارا منتخب طبقہ شریک تھا۔ خواجہ عباداللہ صاحب اختر صدر جلسہ تھے۔ انھوں نے اپنی تعارفی تقریر میں فرمایا کہ بعض لوگوں کی طرف سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ پرویز صاحب فرقہ اہل قرآن سے متعلق ہیں۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ ان کا تعلق کسی فرقہ سے نہیں نہ ہی وہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود ارکان اسلام کی پابندی انہی طریقوں سے کرتے ہیں جو اُمّت میں متواتر چلے آتے ہیں اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔

حدیث کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جائے اُسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں۔ یہ وہ معیار ہے جس کے مدعی خود بڑے بڑے محدث تھے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے تقریر شروع کی جس کا عنوان تھا "قرآن کی رُو سے معاشی مسائل کا حل"۔ ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر جاری رہی جسے کامل جذب و انہماک سے سنا گیا اور قلبی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا۔ تقریر اس قدر واضح اور مدلل تھی کہ اس کے بعد کسی نے سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔

شب کے کھانے پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے ہاں خصوصی احباب شریکِ مائدہ تھے۔ وہاں بھی متعدد مسائل پر گفتگو رہی اور اس طرح جہلم کا یہ یک روزہ پروگرام نہایت حسن و خوبی سے اختتام پذیر ہوا۔ ادارہ طلوعِ اسلام محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کا بصمیم قلب شکر گزار ہے کہ ان کی مساعیِ جمیلہ سے جہلم کی فضا میں قرآن کی آواز ضو پاش ہوئی۔

اس تقریب پر ضلع بزم کے ترجمان، محترم محمد حسین شاہ کے علاوہ، سید حسین اور پنڈ دادن خان کی بزموں کے ارکان بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کا خلوص اور قرآنی ذوق قابلِ قدر ہے

* * *

ماہانہ رپورٹوں کا ملخص

پشاور شہر — زور دیا جا رہا ہے کہ ہر رکن ہفتہ میں کم از کم ایک غیر رکن سے مل کر قرآنی فکر پر بات چیت کرے اور اپنی رپورٹ بزم کے جلسہ میں پیش کرے۔ ٹیپ ریکارڈر کی خرید کے لئے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ برتنوں وغیرہ کی خرید کے لئے پچاس روپے صدر کنونشن کمیٹی کو ادا کئے۔

چھاؤنی — جلسے باقاعدہ ہوئے اور ان میں غیر اراکین کو بھی مدعو کیا گیا۔ صدر کنونشن کمیٹی کو پچیس روپے ادا کئے۔

جہلم ضلع — آمدنی کا چوتھائی حصہ نشر و اشاعت پر اور نصف قیام دار المطالعہ پر خرچ کیا جائے اور باقی چوتھائی حصہ ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ اجلاس دو ماہ میں ایک بار جہلم میں ہوگا۔ محترم پرویز صاحب کی تقاریر سے فضا میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی۔ تقاریر میں سید حسین اور پنڈ دادن خان کے رفقا نے شرکت کی۔

پنڈ دادن خان — صدر کنونشن کمیٹی کو دس روپے ادا کئے۔ لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

سید حسین — تیرہ پمفلٹ و کتب مطالعہ کے لئے دیئے گئے۔ محترم پرویز صاحب کی تقاریر جہلم کے موقع پر بزم پنڈ دادن خان کے احباب کے قیام و طعام کا بندوبست کیا۔

جھنگ — چک ۲۲۸ — پمفلٹ "رحمۃ للعالمین" اور "قرآنی معاشرہ" تقسیم کئے گئے۔ اول الذکر پمفلٹ کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دیہاتی لوگ مستفید ہو سکیں۔

حیدرآباد۔ ٹنڈو محمد خاں بزم کے جلسہ میں مقامی سکولوں کے اساتذہ اور طلبا اور دیگر اصحاب نے شرکت کی۔ قرآنی نظام زندگی پر تقاریر ہوئیں پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ سندھی ادب کی لائبریری میں لٹریچر رکھا گیا۔

سرگودھا۔ چک ۔۔ شمالی جنوری کے طلوع اسلام کے مضامین پڑھ کر سنائے گئے۔ بارہ مختلف کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئیں۔ سرگودھا شہر میں دلچسپی بڑھ رہی ہے اور وہاں بزم کے قیام کی کوشش جاری ہے۔ انگریزی پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ ایک صاحب کے نام طلوع اسلام سال بھر کے لئے جاری کرایا گیا۔ بزم کے فنڈ سے ایک مستحق مفلوک الحال کی دس روپے کی امداد کی گئی جس سے وہ جیل جانے سے بچ گئے۔

سیالکوٹ شہر صدر کنونشن کمیٹی کو پچاس روپے بھیجے۔ بزم کے جلسوں میں درس قرآن ہوا۔

شیخوپورہ۔ چونڈہ رسالہ طلوع اسلام اور چار کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئیں۔ آٹھ اصحاب کو پمفلٹ بھیجے گئے اور رسالت کو خود جا کر دیئے۔ بزم کے جلسہ میں درس قرآن ہوا۔

کراچی دسمبر کے رسالہ کے "لمعات" تقسیم کئے گئے۔ تازہ انگریزی کتابچہ کی ایک ہزار کاپیاں طلب کیں۔ شیرشاہ کالونی اور بیزرٹا لائنز کی لائبریریوں سے مطالعہ کے لئے کتابیں دی جاتی رہیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ جب تک ٹیپ ریکارڈر خرید نہ جائے اس وقت تک بزم کا فنڈ کسی اور مد میں خرچ نہ ہو۔ نیز یہ کہ کراچی میں رسالہ کے خریداروں کی تفصیلات معلوم کرکے ان کو بزم سے روشناس کیا جائے۔

کوہاٹ۔ ہنگو۔ ہفتہ واری اجلاس میں تعلیم یافتہ لوگوں کو مدعو کیا۔ پمفلٹ تقسیم کئے۔ مقام ٹل میں جو ہنگو سے پینتیس میل دور ہے تیزی سے اشاعت کی گئی۔ صدر کنونشن کمیٹی کو دس روپے بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

مردان شہر کئی نئے رکن شامل بزم ہوئے۔ ان میں سے دو طلوع اسلام کے خریدار بن گئے۔ فروری میں سالانہ اجتماع ہوگا جس میں پشاور کے احباب کو مدعو کیا جائے گا۔

درج ذیل بزموں نے رپورٹ نہیں بھیجی

ڈیرہ غازیخاں۔ (شہر و جام پور) راولپنڈی۔ سیالکوٹ (چپارتی و چنی شیخاں) جھنگ (صدر۔ کلری۔ چنیوٹ) لاہور شہر اور قصور۔ لائلپور۔ مردان (ضلع)۔ ملتان (ابتدائی بزمیں)۔ ملتان (ریلوے کی)۔

پمفلٹوں کی چوری

قارئین کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل کراچی کے کسی ادارہ نے آپ کو اپنا لٹریچر بھیجنے کے لئے وہ پتے سرقہ کرلئے تھے جو آپ نے طلوع اسلام حاصل کرنے کے لئے دے رکھے تھے۔ اور جب سرقہ کے متعلق آپ نے ہم سے شکایت کی تھی۔ حال ہی میں بعض خریداران نے شکایت کی ہے کہ اسی قسم کا سرقہ لاہور کے ایک ادارہ نے بھی اپنے لٹریچر کی تقسیم کے لئے کیا ہے۔ قارئین کو چاہیئے کہ ادارہ مذکور کی طرف سے آئے ہوئے خطوط ہمیں بھیجدیں تاکہ تحقیقات میں مدد ملے۔